کشکول محمد علی شاہ فقیر

از

جناب چودھری محمد علی صاحب رئیس ردولی

منیجر صدیق بک ڈپو لکھنؤ

نے

صفحات تعارف ۱/۲۴ و ۱/۱۶ و ۲۸۹/۳۲۴

نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا

۱۹۵۱ء

بار اول ۱۰۰۰ جلد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فہرست مضامین

تعارفِ مصنف

(از جناب صلاح الدین احمد صاحب بی۔ اے ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور)

محمد علی ردولوی ۔ اردو کا اولین فطرت نگار

انیسویں[۱۹] اور بیسویں[۲۰] صدی کے سنگم پر ہماری زبان میں دو ایسے لکھنے والے نمودار ہوئے جنھوں نے اپنے بیان کی شستگی اور اظہار کی سلاست اور ادائے مطالب کی بے مثال صلاحیتوں سے اُردو کی حدود کو حد نظر تک پھیلا دیا اور عوام کو پہلی بار نہ صرف اعلیٰ درجے کی نثر سے لطف اندوز ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، بلکہ اُس رشتے کی تخلیق کی جو مصنف کے قلم کی لرزش کو جمہور کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کرکے ادب کی ایک لازوال خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں منفرد تھے اور اگرچہ بنیادی طور پر ان میں ایک یک جہتی پائی جاتی تھی، لیکن دونوں کے اسالیب نگارش اپنی علیحدہ علیحدہ امتیازی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ، بلکہ دونوں کے کام کے میدان بھی جدا جدا تھے۔ ایک اگر خارجی دُنیا کے میدانِ ناپیدا کنار کا شہسوار تھا تو دوسرا دریائے دل کی گہرائیوں کا غوطہ زن۔ ایک اگر ابلق صحافت پہ سوار، جادۂ

ادب کی نئی نئی منزلیں طے کر رہا تھا تو دوسرا مجلس احباب میں تکیہ لگائے اپنی موہنی کے عمل سے دلوں کے قلعے تسخیر کئے چلا جا رہا تھا۔ اتفاقِ زمانہ دیکھئے کہ ایک نے کم و بیش چالیس برس ہوئے اپنی بساطِ عمل طے کر کے رکھ دی اور دوسرا جس آہستگی اور خاموشی سے اس میں داخل ہوا تھا، آج بھی اس کے پر بہار راستوں پر اسی طرح دبے پاؤں چل رہا ہے۔ اور اپنی اس سیر صبح گاہی میں کبھی کبھی ہمیں بھی شریک کر لیتا ہے۔ ناظرین! ان میں سے ایک کا نام عبدالقادر اور دوسرے کا محمد علی ہے۔ وہ دونوں ہم سن ہیں۔ اور خدا کرے کہ ایک عرصۂ دراز تک اس زندگی میں ہم سن ہی رہیں۔

اُردو ادب کا کوئی سنجیدہ طالب علم عبدالقادر کی ساحرانہ سلاست سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سہل ممتنع لکھتے ہیں اور اپنی آسان نگاری میں بڑی بڑی نازک باتیں نہایت صفائی اور صحت کے ساتھ سامنے لے آتے ہیں۔ اسی طرح محمد علی جب اپنے عروج پر پہونچتے ہیں تو بو نصیبن یا امامن مہری کی زبان میں نفسیات انسانی کی وہ وہ گتھیاں سلجھا کے رکھ دیتے ہیں کہ ناظر ششدر رہ جاتا ہے۔ مطالب کے لحاظ سے دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عبدالقادر کا موضوع بیشتر خارجی ہوتا ہے اور وہ خارج سے داخل کی طرف بالعموم رجوع نہیں کرتے، بلکہ اپنی بیرونی دنیا کے مسائل و مناظر ہی میں کھو جاتے ہیں۔ اسکے خلاف محمد علی اگرچہ اپنے افسانوں اور خاکوں کی بنیاد بیشتر محسوسات خارجی ہی پر رکھتے ہیں، اور وہ جو

کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی کچھ عین مین ہمیں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اپنے موضوع کی طرف انکی تنقید می خالصتاً داخلی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ناظر کا ہاتھ پکڑے ایک نامحسوس انداز میں اُسے اس دنیائے سنگ و خشت سے نکال کر، اس عالم خیال میں لے کر اُتر جاتے ہیں، جس کی رنگینی، حقیقت کی عریاں سادگی سے آنکھیں ملاتی ہے اور محجوب نہیں ہوتی۔ محمد علی حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کا ایک بے رحمانہ امتزاج پیش کرتا ہے، اور ازبسکہ وہ اپنے مشاہدے میں صداقت سے کبھی آنکھیں نہیں چراتا، اور اپنے بیان میں تخیل کی باگیں کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑتا، اور اس لیے اُس کا پیش کردہ امتزاج فنی ادب میں ایک نہایت صحت مند معیار کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اس معیار پر بہت کم فن کاروں کی تخلیقات پوری اترتی ہیں۔ عبدالقادر سے میں نے اس کا مقابلہ محض اُس کی سلاستِ زبان اور لطافتِ بیان کے پیش نظر کیا ہے۔ ورنہ یہ مخفی نہیں کہ دونوں کے میدان اور میلان بالکل مختلف ہیں۔ عبدالقادر افادی ادب کے بہت بڑے معمار ہیں۔ اور انھوں نے بیانیہ نثر کا ایک بے نظیر اور ترقی پذیر اسلوب ہماری زبان کو بخشا ہے۔ وہ فنی ادب سے چنداں دلچسپی نہیں رکھتے اور ان کا موضوع انسان نہیں بلکہ وہ عالم ہست و بود ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اُنھیں فنی ادب اور اُس کی مقتضیات سے چنداں واسطہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے خلاف محمد علی کا موضوع بیشتر صورتوں میں خود انسان اور اس کا وہ جہان خیال ہے جس میں وہ اس مختصر زندگی کے چند لمحے بسر کرتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن کی تخلیقات بیشتر اُنکی تخیل کی مرہون ہوتی ہیں۔ یا وہ اُن کی تعمیر کا مسالہ سراسر اس دُنیائے داخلی سے حاصل کرتے ہیں جو اُنکے اپنے ذہن رسا میں آباد ہے۔ نہیں حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ محمد علی اپنے فکر کو زیادہ تر فسانے کا لباس پہناتے ہیں۔ اور اپنے افسانوں میں نفسیاتِ انسانی کے بعض نازک ترین پہلوؤں کو بھی بے نقاب کر جاتے ہیں لیکن اس میں قطعاً کلام نہیں کہ وہ بنیادی طور پر مفکر نہیں بلکہ خالص فسانہ نگار ہیں۔ وہ آپ کو اس لیے کہانی نہیں سناتے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنی فکر کی کسی کاوش یا اپنے تخیل کی کسی گرفت کا اظہار چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ اس لئے سناتے ہیں کہ انھیں اسے سنائے بغیر چارہ نہیں اور اگر وہ نہ سُنائیں تو شائد بیمار ہو جائیں۔ وہ نہ تو نذیر احمد کی طرح کسی معاشرتی اصلاح کے علمبردار ہیں، نہ پریم چند کی مانند سماج کے بعض انوکھے تقاضوں کے نازبردار۔ اور نہ انھیں ہمارے ترقی پسند دوستوں کی طرح جسم فروش یا مزدور طبقے کے مسائل کا کوئی فسانوی حل تلاش کرنے کی مجبوری ہے۔ میری ناچیز رائے میں وہ زندگی کے محض ایک خوش نظر تماشائی ہیں کہ اسکے پر رونق بازار میں سے اسکی رنگا رنگ کیفیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے خراماں چلے جا رہے ہیں۔ اور جہاں کہیں انکی نگاہ کسی دلچسپ چیز پر پڑتی ہے وہ ایک لمحہ کے لیے

رک کر اُسے نظر بھر کر دیکھ لیتے ہیں۔ اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی نگاہ کیوں اور کہاں رکتی ہے اور اس انتخاب کے عناصر کیا کیا ہوتے ہیں۔ ان عناصر کا ایک ہلکا سا جائزہ ہم آگے چل کر لیں گے، یہاں مجھے صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ محمد علی کسی مقصد یا نظریے کی تبلیغ کے لئے کوئی کہانی بنا کر ہمیں نہیں سناتا، نہ اپنے کسی تخیل پارے کو پھیلا کر فسانے کے لباس میں پیش کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کا ایک زیرک طالب علم ہے۔ اور اس کے مطالعے میں جو غیر معمولی یا لطیف یا مضحکہ انگیز صورتیں اسکے سامنے آتی ہیں، یا اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کی بنا پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے جن نتائج کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور ان نتائج کو وہ ایک نہایت لطیف و بلیغ پیرائے میں، کہ سلاست و رنگینی سے بیک وقت متصف ہوتا ہے ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اور پھر اس بات سے قطعًا بے نیاز ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی پیشکش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خالص آرٹسٹ ہے، اور اُسے اپنی تخلیقات سے یہیں تک سروکار ہے کہ وہ اس نہاں خانۂ محسوسات سے نکل کر لباسِ اظہار پہن لیں۔ رہا یہ کہ ہم اُن کے جمال جہاں آرا سے کیا اثر قبول کرتے ہیں، اس سے اُسے کوئی غرض نہیں۔ اس کا یہ انداز نظر اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اُس کے ذریعہ اظہار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انفرادی بلکہ خود سرانہ رویہ

روا رکھتا ہے۔ وہ اس بارے میں کسی سمجھوتے کا بھی قائل نہیں۔ اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو عین وہی الفاظ دینے پر اصرار کرتا ہے، جن میں وہ اس پر وارد ہوئی اور اگر آپ قبول عام یا رواجِ ادب، یا خوف محتسب کے پیش نظر اُسے کسی متبادل لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں، تو وہ اُسے سو میں سے نوے صورتوں میں رد کر دے گا اس سلسلے میں مجھ سے چودھری صاحب کی متعدد جھڑپیں ہوئیں، اور اگرچہ اُنھوں نے میرے ادارتی اختیارات سے مجبور ہو کر اکثر میری بات مان لی، لیکن کس طرح مانی، یہ اُن کا دل ہی جانتا ہے۔ دو ایک موقعوں پر البتہ وہ میری ترمیم سے خوش بھی ہوئے لیکن یہ مواقع بہت شاذ تھے۔ تو اس سے اُن کے خالص فنی زاویۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے۔ فن کار اپنی غیر مرئی محسوسات کو لباسِ اظہار پہناتا ہے، اولاً اس لئے کہ وہ اس کے لئے اپنے آپ سے مجبور ہے۔ اور ثانیاً اس لیے کہ وہ قدرت کی طرف سے تقسیم مسرّت کی خدمت پر مامور ہے مسرّت کی تقسیم کا اندازہ وہ خود مقرر کرتا ہے۔ اور اس بارے میں اُسے کسی تعلیم یا تلقین کی ضرورت نہیں۔ فن کی منزل اصلی یہی ہے، اس سے آگے جو راستہ جاتا ہے وہ تصنع، آورد مصلحت، اصلاح، تبلیغ اور پروپیگنڈے کی پستیوں میں اتر جاتا ہے۔

محمد علی کا میدانِ تگ و تاز اودھ کی قصباتی فضا اور اسکی زمرد زندگی

ہے۔ اس فضا میں اُس نے اپنی ذاتی زندگی کے کم و بیش ستر برس گزارے ہیں۔ اور یہ ایک فطری تقاضا تھا کہ وہ اپنے فنی کارناموں میں اسی فضا کا عکس پیش کرے۔ دنیا میں جتنے بڑے فن کار گذرے ہیں، سب نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور جبتک ادب میں خالص فن کی قدریں باقی ہیں۔ ایسے ہی فن پاروں کو عظمت و عزت کے وہ مقامات حاصل رہیں گے، جو فطری طور پر ان کا حق ہیں۔ آپ میں سے جن حضرات نے والٹر سکاٹ کا آئی ون ہو پڑھا ہے یا ایمیلی برانٹی کی وورنگ ہائٹس، یا گورکی کی ایک خزاں کی رات، یا موپساں کی سکیپ گوٹ یا کالی داس کی شکنتلا کا مطالعہ کیا ہے یا شرت چندر کا انا پورنا کا مندر دیکھا ہے، اُن سے میں یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے مطالعے کے استغراق میں کیا انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی طلسمی جھولے میں بیٹھ کر خود اُس دنیا میں پہنچ گئے ہیں، جس دنیا میں اُن کا داستان گو سانس لے رہا ہے۔ وادیٔ نربدا کے کسی لہلہاتے ہوئے جنگل کی معطر گپھائیں ہوں، یا شمالی برطانیہ کے ویران پہاڑی قلعوں کی سنگین اور کپکپاتی ہوئی نیم روشن خلوتیں، ہمارے حواس ظاہری نے دونوں میں سے کسی ایک کو محسوس نہیں کیا لیکن فن کار کی طلسمی چھڑی کی ایک ہی جنبش سے ہم چشم زدن میں ان فضاؤں میں جا پہنچتے ہیں۔ اور ان رومانوں اور ان کہانیوں کے کرداروں کے دل کی دھڑکنیں ہمارے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اور

ہیرو کی آنکھوں کی چمک اور ہیروئن کے سانس کی خوشبو ہمارے کلبۂ ذہن اور مشامِ جان میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور ہم ان کے رنج و راحت کے شریک اور اُن کے حاضر و غائب کے رفیق بن جاتے ہیں۔

اس کے خلاف آپ نے بیسیوں ایسے فسانے ملاحظہ کیے ہوں گے اور درجنوں ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جو آپ کو بس یونہی چھوتی ہوئی سی گزر جاتی ہیں اور آپ کے دل یا دماغ پر اپنا کوئی نقش دیر پا نہیں چھوڑتیں۔ فسانے کی ان مختلف صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کا خالق اپنی تخلیق کے عناصر میں کسی مقصدِ خاص کو شامل نہیں کرتا۔ وہ جس طرح زندگی کو دیکھتا ہے۔ جس طرح اُسے محسوس کرتا ہے، عین اسی طرح اُسے اپنے تصوّر کے خلوص اور اظہار کی شدت کی تائید سے ہم تک منتقل کر دیتا ہے۔ اور اس عملِ انتقال میں وہ اہلیت کم یاب جو اُسے ارزانی ہوئی ہے، اور جسے ہم فن کا نام دیتے ہیں، بروئے کار آتی ہے۔ اور اظہارِ محض کو حسنِ اظہار سے آراستہ کرتی اور سخنِ سادہ کو گرمیٔ گفتار عطا کرتی ہوئی اپنی منزل کو جا لیتی ہے دوسری قسم کی تصانیف اُن صاحبوں سے نسبت رکھتی ہیں، جو فن کار نہیں بلکہ محض کاریگر ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک دیے ہوئے نمونے پر گاہک کے حسبِ منشا اُس کے کام کی چیز تیار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مصنوعات سے زندگی کے ادنیٰ اور معمولی کام تو لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ شے لطیف جسے اہتزازِ نفس اور بالیدگیٔ روح کا منبع کہیے اور

جو سوز و ساز کی ہمہ رنگ کیفیتوں سے ہم آغوش ہوتی ہے، ان کاریگروں کے تصوّر سے بھی ماورا رہتی ہے۔ اور عنقا کی طرح ان کی پست بستیوں پر اپنا سایہ بھی نہیں ڈالتی۔

اُردو کے فن کار ادیبوں میں جو مادرِ فطرت کے آغوش میں پلے اور بڑھے اور جن کی سحر بیانی اسی کے سہانے بولوں کی مرہون اور جن کی فکر و دانش اُسی کی تہائی پہیلیوں کی ممنون ہے۔ محمد علی ایک یکتا اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے یکتا کا لفظ پورے ارادے اور ذمہ داری سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے کی حدود سے کبھی باہر نہیں جاتے وہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ اور ان کا کوئی قصہ کسی اڑتے ہوئے جذبے یا کسی اُبلتی ہوئی تحریک سے جنم نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ اُن کے کسی خیال افروز مشاہدے یا اضطراب انگیز مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ اس حیثیت سے بھی ایک امتیاز خاص کے مالک ہیں کہ وہ مُدت کی حدود کو ایک بے مثال شان بے تکلفی سے عبور کر کے اپنے ناظر سے اس طرح گھُل مل جاتے ہیں، گویا وہ خود قصہ نہیں لکھ رہے بلکہ وہ اور اُن کا پڑھنے والا دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس قصے میں سے روحانی طور پر گزر رہے ہیں۔ یہ کیفیت ہمارے ہاں انھیں سے خاص ہے۔ میری اس گذارش سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زندگی کے محض ایک جابکدست عکاس ہیں ہرگز نہیں۔

زندگی کی تصویر کھینچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس تصویر میں بڑے لطیف اور نادر رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں۔ اور یہ رنگ اپنی شوخی، ان کی شوخیٔ طبع اور سُرخی، اُن کے خونِ دل سے مستعار لیتے ہیں، زندگی کا ہر کامیاب مصوّر ایک دیدہ بینا کے ساتھ ایک چشمِ باطن سے بھی بہرہ یاب ہوتا ہے۔ محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے وہ ایک نادرہ کار مصوّرِ محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہرِ نفسیات بھی ہیں۔ اور اُن کے بیشتر افسانے علم النفس، خصوصًا اسکے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ نہایت اخلاص سے کرتے ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر بھی نمایاں کرتے ہیں اور اس کی پہیلیوں کا حل بھی بتاتے ہیں۔ حقیقتاً وہ تصویر کشی کے لئے بھی زندگی کا وہی پہلو چنتے ہیں جس میں کوئی نفسیاتی خصوصیت پائی جاتی ہو۔ اسی لیے اُن کی تصویریں سپاٹ نہیں ہوتیں بلکہ وہ ناظر کے حواس پر چھا جاتی ہیں۔ اور بیشتر اوقات اس پر حملہ بھی کر بیٹھتی ہیں اور اس کے پندار کو چھلنی چھلنی کر دیتی ہیں۔ مثلاً اُنکے ناظرین میں کوئی ادھیڑ عمر کی صحتمند بیوہ جب ان کے افسانے "دھوکا" میں ناظمہ اور اُس کے اندر والے کا مکالمہ پڑھتی ہے تو بجز اس کے کہ وہ اپنا مُنھ نوچ لے یا سر پیٹ لے اور کیا کر سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہی نا، کہ کہانی کو دیا سلائی دکھا دے اور جائے نماز بچھا کر ستر نفلوں کی نیت باندھ لے۔ اب آپ مضطرب ہوں گے

کہ میں اس مکالمے کی ایک جھلک آپ کو یہیں دکھا دوں اس لیے پہلے ہی سے تعمیل ارشاد کئے دیتا ہوں۔

صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ایسے باتیں کرنے لگتا تھا۔

"سنیئے صاحب میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں۔ اگر آپ کو اس میں دو بدو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس کو دور رد فان کیجئے۔ اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے جائیے کہ ناظمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ اُن کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا۔ اور ان کی حس باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا:۔

اندر والا:۔ سنو بی بی ناجو! تم اور صغیر (یہ اُن کے ہمدرد کا نام ہے) پردے سے ملے، گھڑیوں باتیں کیا کئے ہو۔ اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجو:۔ مجال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس چھوٹا اور پھر وہ تو مجھ کو باجی کہتا ہے۔

اندر والا:۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو۔

ناجو:۔ تو اس میں کیا ہرج ہے، اگر میرے خیال دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا:۔ تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو:۔ ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندروالا:۔ پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں ہنسی تو پھنسی پرانی مثل۔
ناجو:۔ ہو اگرے مثل اپنے بڈھے پر سے ہزار جوان صدقے اتارے ہیں۔
خیر اب اس کا ذکر ہی کیا جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اسکا ذکر کیا ہے۔
اندروالا:۔ بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو، اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔
ناجو:۔ میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے۔ اس کی بیوی تو ویسی ہی ٹھپیا ہے۔
اندروالا:۔ مگر وہ صورت میں تو تمھارے تلووں کے برابر نہیں ہے۔
ناجو:۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر اُس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔
اندروالا:۔ اور جو ہو جائے۔
ناجو:۔ ہو جائے تو ہماری جوتی سے لترے، پاپوش سے، مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔
اندروالا۔ یہ دیکھو کُھلا نا۔ یہی تو میں کہتا تھا۔
ناجو:۔ ہو گا بھئی۔ ہم کیا کریں نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔
اندروالا:۔ اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی تو جاتی ہو۔
ناجو:۔ ہاں سو جاتے ہیں، تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں منصرم صاحب تو ہیں نہیں۔
ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرے گا۔

اندر والا:۔ ہاں۔ اب ٹھیک راستے پر آگئیں یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے تو بیجا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر بہن کبھی ترس گیا۔

اور پھر اس کے بعد کہانی جس موڑ سے گزرتی ہے ہمیں اس وقت اُس سے غرض نہیں لیکن لگے ہاتھوں اُس افراتفری کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیئے جو صغیر کے بامراد ہونے کے بعد اس کے دل میں اسی اندر والے نے مچائی۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یونہی کبھی دیکھ لی ہوگی۔ اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل، وہ رعب حُسن وہ تناسب اعضاء وہ مزاج کی شگفتگی۔ اور یہ ٹھہرے بھوکے بنگالی۔ آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔ (واضح رہے کہ ناظمہ تئیس برس کے پیٹے میں تھی اور صغیر اُن سے آٹھ برس چھوٹا۔) البتہ دو چار برس کے بعد کچھ کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر:۔ بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں ہے۔

اندر والا:۔ بڑھاپا تو نہیں ہے۔ مگر وہ پنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر:۔ اجی محبّت اصل چیز ہے۔ پنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا:۔ محبّت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے، اِن دونوں کو

ملاتے کیوں ہو۔

صغیر:۔ جوانی کے دن کی ہے، محبّت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا:۔ ہے تو ہمیشہ کی، مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر:۔ محبّت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔

اندر والا:۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ محبّت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے بیسنی روٹی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے۔ بیسنی بیسنی ہی ہے۔ مگر کیا روز روز پلاؤ کھا کر کبھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا؟ وہ بیسنی والی سُندراہٹ تو تمھاری پہلی بی بی ہی میں ہے۔

صغیر:۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو مگر ہماری اس بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے

اندر والا:۔ ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب! ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بیوی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہنچ آسان ہے اور نہ کوئی بات نہیں۔

صغیر:۔ یار یہ تو ہے، مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ اور مجھ کو چین نصیب نہ ہوگا۔

اندر والا:۔ خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی، مگر ہے بڑی سخت بات، اور غضب تو یہ ہے کہ بغیر اس کے بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔

صغیر:۔ یار تو پھر کیا کریں۔
اندروالا:۔ کروگے کیا، ملاپ کرو۔
صغیر:۔ اور ناظمہ کو کیا کریں..... اُس سے چار آنکھیں کیسے کریں گے۔
اندروالا:۔ سب کچھ ہو جائے گا، بُدھو میاں! ہم ہوں، کہ تم ہو، کہ ناظمہ ہوں، سب ٹھہرے حکم کے بندے حسِ باطن کے۔ وہاں سے جو اشارہ ہو گا وہ کرنا ہی پڑے گا آپ کون سے ایسے خوبصورت تھے، کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ جائیں۔ حسِ باطن نے کہا۔ ناظمہ! منصور صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سن کو ترس گئیں۔ لہٰذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کرلو۔ ناظمہ نے کرلیا۔ اب تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو بھی نہ چھوڑنا۔ مگر اپنی کم سن بی بی سے ملاپ کرلو۔ بندگی بے چارگی۔ تمھارا بس ہی کیا ہے۔"

بعد کے قصے سے ہمیں مطلب نہیں لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا، فن کار کی اپنے موضوع پر گرفت کیسی کڑی ہے، اور وہ ناظر کی توجہ کو نقطۂ مطلوب پر مرکوز رکھنے میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل کرتا ہے۔ مضمون پر ایسی ماہرانہ گرفت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ آپ یہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ وہ ادائے مطالب کے لیے کم از کم الفاظ استعمال کرتا ہے، لیکن ہر لفظ معنی کی بارود سے بھرپور ہوتا ہے اور جس طرح اور جس مقام پر اُسے صرف ہونا ہے، وہ اُس سے خطا نہیں کرتا۔ الفاظ پر یہ قابو اور معانی سے یہ مفاہمت کچھ محمد علی ہی کا حصّہ ہے۔ الفاظ

ومعانی کی یہ فن کارانہ آمیزش وآویزش بجائے خود ایک مطالعے کی طالب ہے۔ مگر اس وقت ہمارے سامنے مصنف کی اور بہت سی خصوصیات اپنی قطار توڑ توڑ کر سامنے آرہی ہیں مثلاً یہ کہ وہ نفسیات کا ایک بہت بڑا ماہر ہونے کے علاوہ جنسیات کا ایک نہایت صحت مند شارح ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے بیشتر بزرگوں کے برعکس، محمد علی جنسیات سے کسی قسم کی تنفر آمیز اجنبیت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ وہ نہایت سکون واطمینان سے اپنے افسانوں اور خاکوں میں اس کی معمولی اور غیر معمولی، نارمل اور ایب نارمل کیفیتوں کا امتحان اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اور وہ گھناؤنا تصور دور کرنے میں کاوش کرتے ہیں جو جنس کے متعلق اوّل دن سے اُن کے ناظر کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا ہوتا ہے۔ کاوش سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس پر کوئی افسانوی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ میرا مطلب محض اسی قدر ہے کہ اُن کے موضوعات کے انتخاب میں جنس عادتاً ایک اہم حصّہ لیتی ہے۔ اور جب وہ اپنے کسی ایسے مطالعے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس سے وہ اپنے ناظر کے لئے کسی قسم کی لذت کوشی کا سامان بہم نہیں پہونچاتے، بلکہ ... زیر نظر مسئلے کا نہایت جچا تلا اور صحت مند جائزہ لیتے ہیں۔ اور زندگی کے عوائل میں جنسی کارفرمائیوں کو وہی مرتبہ دیتے ہیں جن کی وہ بجا طور پر حقدار ہیں۔ اُن کے ہاں ہمیں بعض دیگر لکھنے والوں کے برعکس، لذت فروشی کا سُراغ تک نہیں ملتا۔

اس کے باوجود جو جنسی حقائق اُنھوں نے بے نقاب کیے ہیں۔ وہ اس ادنیٰ درجے کی "جنسِ خام" سے بدرجہا قیمتی ہیں، جو ہمارے بعض مقبول مصنفین آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے زندگی کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور از بسکہ جنس، زندگی کی ایک بنیادی کیفیت ہے اور اسکے مدوجزر میں ایک نہایت اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ اس لیئے ان مشاہدات و محسوسات کے انتخاب میں بھی جو کسی فن کار کو احساس سے صورت میں انتقال کیوقت درپیش ہوتا ہے، جنس اپنا پورا حصّہ لیتی ہے۔ یہاں تک سب لکھنے والے برابر ہیں۔ لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھیں تو ایک تنہا لغزشِ پا سارا فرق پیدا کردیتی ہے۔ لذت کوش جنس فروش علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ اور وہ فن کار علیحدہ جو جنس کو دیگر عطیات وہبی کی طرح قدرت کی ایک مقدس اور دل کُشا امانت سمجھتے ہیں۔ اور اسے سفلیات سے ہم صحبت اور آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ محمد علی فن کاروں کے اس ثانی الذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہماری زبان میں بے عیب جنسی کہانیاں لکھنے میں اُن کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ آنکھوں کی زبان، تیسری جنس، دھوکا۔ اور اُن کا طویل مطالعہ "جنس" جس میں کنواری مس ہیلن اور گنجفہ کھیلنے والی رنڈی اور مچھلی والی سے روزانہ مار کھانے والے انسپکٹر صاحب بڑے گینڈے کے گرد از ہی نفسیات "جنس" کے نہایت بیش بہا اور نادر نمونے ہیں۔ جو براہ راست زندگی سے حاصل

کیے گئے ہیں۔ اور جن میں کوئی بے کار یا مصنوعی رنگ نہیں بھرا گیا، اور نہ کسی قسم کی لذت آفرینی کی کوشش کیگئی ہے۔ چودھری صاحب نے ان بےمثال اور حیرت انگیز افسانوں کے علاوہ اور کہانیاں بھی لکھی ہیں، جن میں امیری کی بُو اودھ کی مٹتی ہوئی شرافت کے ایک دردناک مرثیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہانی اس قابل ہے کہ اُسے اُردو کی پاکیزہ ترین کہانیوں میں ایک امتیازی مقام دیا جائے۔ اودھ کی معاشرت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ان کا خاص مطالعہ ہے۔ اور اس مطالعے کے بعض پہلو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس مطالعے کے فسانوں میں ہمیں بیشتر ایسے کردار ملتے ہیں جو اسی نسل کے ساتھ ختم ہو جائینگے۔ وضعداری، خلاص دوستی، دوست نوازی، فن پردازی، تفریح پرستی، بے نیازی اور استغنا کے چلتے پھرتے مجسّمے، کوئی دن کی بات ہے کہ سایوں میں تبدیل ہو جائینگے، مرزا منش میٹھا معشوق، خوش مذاقی کے اندھے۔ اور زندگی کا مقصد انہی نادرِ روزگار لوگوں کی مرقع نگاری ہے اور اگرچہ انھیں بقائے دوام دینے والے کا قلم انکے محاسن کی تفصیل میں ایک پرخلوص اور دل کشا روانی دکھاتا ہے، لیکن کبھی کبھی اُن کی زمانہ ناشناسی اور درماندگی پر انھیں کچوکے بھی لگاتا جاتا ہے۔ اور اس عمل میں بعض دفعہ وہ طنز کی رفعتوں پر جا پہنچتا ہے۔ میری ناقص رائے میں محمد علی نے یہ خاکے کسی اصلاح کے خیال سے نہیں لکھے بلکہ اپنی روزمرہ زندگی میں ایک مٹتی ہوئی معاشرت کے کے جو قابل لحاظ نمونے وقتاً فوقتاً اسکے سامنے آئے انھیں اُس نے ادب کے عجائب خانے میں محفوظ کر دیا۔ آنیوالی نسلیں اُن پہ آنسو بہائینگی یا اُنسے عبرت یا تفریح حاصل کرینگی۔ یہ سکا در دسر نہیں ہے۔

محمد علی کے خیال انگیز فسانوں میں سلیم کا نگ اور گناہ کا خوف ایک خاص تہ رکھتے ہیں۔ گناہ کا خوف، سماج کی ظواہر پرستی پر ایک لازوال طنز ہے اور سلیم کا نگ مسیح کے اس قول کی بازگشت، کہ میں انسان سے مایوس نہیں ہوں۔ دونوں کہانیاں حقیقی زندگی کے پس منظر پر اُبھری ہیں اور اپنے اندر مسرت اور تفکر کے انمول خزانے پنہاں رکھتی ہیں۔

کہانیوں کے علاوہ محمد علی نے اما من مہری کی زبان سے روزمرّہ کے سماجی مسائل پر پانچ طنزیے ایسے بھی لکھے ہیں جنھیں اُردو کی انشائے لطیف میں ایک نہایت ممتاز مقام ملنا چاہیئے۔ اما من مہری کے فلسفیانہ خیالات پانچ عنوانات پر مشتمل ہیں، ایمانداری بہترین دور اندیشی ہے۔ رکھ رکھاؤ تیہا، طنطنہ، جوش، غصّہ، جذبہ۔ کام کاج اور خیر خیرات۔ انکے لکھنے کا خیال انھیں Barry Pane کی ایک کتاب کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔ میں نے نقش اول تو نہیں دیکھا، لیکن نقش ثانی اپنی خیال انگیزی اور خلش آفرینی کے اعتبار سے ہمارے طنزیہ ادب میں ایک لاثانی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد علی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کو بہ یک وقت خارجی اور داخلی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے۔ اور مقابل کی یہ خصوصیات ایک آدھ فن کار میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی محسوسات کو اپنے افکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ بیشتر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامۂ تنگ اسی صنم عربدہ خو کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ وہ خارجی دنیا کے معمولی سے معمولی واقعات کو اپنے احساسات میں سمو کر انھیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کر دیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو ہم نہیں معلوم

کر سکتے کہ ان میں محرک کون تھا، اور تحریک کس نے پائی مثلاً وہ ایک جگہ گرمیوں کی صبح میں نسیم کی آہستہ روی اور اُس کی روانی میں ایک بڑی بی کی مناجات خوانی کا ذکر کرتا ہے۔ جزئیات کا یہ مطالعہ بجائے خود بلحاظ درجہ حیرت خیز ہے لیکن جب وہ اس تاثر سے کردارِ زیرِ نظر کے ایک عمل کی نفسیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے۔ اور لپکتے ہی تاثر کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو حیرت اپنی اُنگلی دانتوں تلے دبائے رہ جاتی ہے۔

اور آخر میں میں اپنے ممدوح کی نسبت اُن الفاظ کو دہرا دینا ہی کافی سمجھتا ہوں جو حال ہی میں میں نے اُن کے ایک نمائندہ فن پارے سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔

"چودھری محمد علی کا سا پیرایۂ بیان ہمارے عہد کے کسی فسانہ نگار کو نصیب نہیں ہوا حقیقت پروری اُس پہ نثار اور دلنوازی اس پہ تصدق ہے۔ اور اُن کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں اُسکے لئے انھیں کوئی اہتمام یا تکلّف نہیں کرنا پڑتا۔ فطرت ایک ورقِ روشن کی طرح اُنکے پیشِ نظر رہتی ہے اور اس کے جو اسرار اُنکی نگاہِ انتخاب میں سما جاتے ہیں، وہ انھیں بے محابا اپنا لیتے ہیں۔ محمد علی کسی موضوع کو سامنے رکھکر اسکی تعمیر کیلئے اپنے تخیل سے مسالہ نہیں مانگتا، بلکہ زندگی اپنی بوقلموں کیفیتوں کو لئے ہوئے اسکے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ اور فن کار، جب کبھی اُس کا جی چاہتا ہے، اور جو کچھ اُس کا جی چاہتا ہے، اسکے دامن و لت سے مٹھیاں بھر بھر کے لیتا ہے۔ تو یہ ہے محمد علی زندگی کا ایک زیرک ناظر، اُردو کا ایک صاحب طرز ادیب، اور ہماری زبان کا اولین فطرت نگار۔ صلاح الدین احمد بی۔اے

ایڈیٹر "ادبی دنیا"، لاہور۔

عرض حال

یہ کہانیاں اور یادگاریں مختلف پرچوں میں چھپ چکی ہیں۔ کچھ پہلے پہل شائع ہو رہی ہیں۔ اکثر پرچے مرحوم ہو گئے۔ جیسے "نیا ادب" "منزل" "نئی روشنی" "نقیب" اور "اضطراب" وغیرہ خدا ان کو انکی نیکیوں کا پھل دے۔ کچھ ہیں جو آب و تاب کے ساتھ اب بھی جاری ہیں جیسے "ادبی دنیا" لاہور خدا ان کو عمر و اقبال عطا فرمائے۔

صلاح الدین احمد صاحب ایڈیٹر "ادبی دنیا" کا شکریہ خاص طور سے ادا کرتا ہوں۔ انھوں نے میرے کشکول میں تقریظ کی ایسی بھیک ڈالی کہ مالا مال کر دیا۔ موصوف کی تحریر سے ایک نقصان بھی ہو گیا۔ یعنی تقریظ کی بلندی اور گہرائیوں کی وجہ سے میری غریب سطحی کہانیوں کا بھرم کھل گیا۔ بہر حال خدا "ادبی دنیا" کے خدمات تادیر جاری رکھے اور اس نادیدہ مشتاق کو ایڈیٹر کے دیدار اور دولت ہمکلامی سے مسرور کرے۔

بندہ

مصنف عفی عنہ

کشکولِ محمد علی شاہ فقیر

محمد علی رُدولوی عفی عنہ

انتساب

میرے بچّوں کے نام جو اس بڑھاپے میں
مجھ سے دُور دُور جا پڑے

مصنّف

(مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

عشق بالواسطہ

لارڈ کرزن ہندوستان کے سابق وائسرائے اور انگلستان کے مشہور سیاستدان کی بابت مشہور تھا کہ وہ "میں" کا استعمال بہت کرتے تھے قیصر ولیم شہنشاہ جرمنی میں بھی لوگ یہی عیب بتاتے تھے۔ نفسیات کے ماہرین کہا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنی انانیت کی وجہ سے وہ ٹھوکریں کھائیں گے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی دوسرے یاد رکھیں گے۔ وہ دونوں تو چل بسے۔ اب اس زمانے میں ایک ہم ہی خودی کے قدردان رہ گئے ہیں رہے نام اللہ کا۔ تو ہم بھی کب تک۔ ناظرین کو اگر میری بات میں شک ہو تو واحد متکلم کا صیغہ اس تحریر میں گنتے جائیں ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے معلوم ہی ہو جائے گا۔ میرے ان دونوں ہم خیالوں میں صفات یہی تھے جن کو سراہنے میں ان کو لطف آتا تھا ہم میں ذری صفات کی کمی رہ گئی ہے۔ اس لئے ہم اپنے عیوب ہی کا ذکر کر کے سڑا منہ سوندھا کرتے ہیں عیوب کا لفظ تو ہم نے مصنف خوار معترضین کا منہ بند کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اگر ہم اُنکو واقعی عیب سمجھتے تو بیان ہی کرنے کیوں بیٹھتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ کمزوریاں کہہ دیتے وہ بھی آپ کی خاطر سے ورنہ ہم تو اُن کو صفات ہی سمجھتے ہیں۔ اپنے عیوب اور صفات کی طویل فہرست

میں ہم جس عیب کا تذکرہ کرتے جاتے ہیں وہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتا ہے
دنیا عجب جگہ ہے۔ یہاں دل میں کچھ ہو مگر زباں پر وہی ہو گا جس کو سننے والے
اور کہنے والا سب ہی جھوٹ جانتے ہیں۔ مگر سچ پکارتے رہتے ہیں۔ آپس
میں سمجھوتا اسی پر ٹھہرا ہے۔ جیسے چوروں میں ہوتا ہے۔ عورت کا نام آیا نہیں کہ
کہ ان حضرات کا ذہن عیوب کی طرف منتقل ہوا نہیں۔ اب لاحول ولا
قوۃ ہے الحیاءُ من الایمان ہے۔ استغفراللہ کا زور بندھا ہے دل کا
حال تو خدا ہی جانتا ہے کہ صرف منہ میں شیخ فرید ہے۔ ورنہ بغل میں انٹیں
ہم سے بھی زیادہ لئے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ حافظ شیرازی۔ شیخ سعدی اور عمر خیام
رحمہم اللہ تعالےٰ کے قدموں سے لگے موچھوں پر تاؤ دیتے چلے جاتے ہیں۔

من ارچہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ
ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند

گر کند میل بخوباں دل من خورد مگیر
کیں گناہے است کہ در شہر شما نیز کنند

با ماہ جبیں نشستہ در ویرانے
عیشے است کہ ہست حدِ ہر سلطانے

تو وجہ کیا کہ ہمارے دشمن لوگ عورت کا صرف ایک ہی مصرف جانتے
ہیں اور ہم خدا کی اس "موہبت عظمیٰ عطیہ کبریٰ" کی قدر پہچانتے ہیں کہ

چاہے ابو الآدم کی پہلی خدائی خلافت ہو چاہے ابو القاسم محمدؐ کی آخری رسالت ہو۔ حوّا اور خدیجہ سلام اللہ علیہما کی ضرورت ہمیشہ تسلیم ہوئی ہے ذرا غور تو فرمائیے۔ حضرت آسیہ نہ ہوتیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیسی بنتی۔

پولیٹکل ضرورت سے ایک بار ہم الہ آباد گئے۔ کئی دن کی مصروفیت، اور ہم آدمی ٹھہرے کاہل۔ تھک سے گئے۔ مگر لطف کے جلسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ہم سے زیادہ ہماری بی بی پریشان ہو گئیں۔ مہاوٹیں جو برسنے لگیں تو ڈنر ٹیبل اور ڈرائنگ روم، پارٹیوں اور چائے کی دعوتوں کا مزا کرکرا ہو گیا۔ اور بی بی کی طرف سے واپسی کا اصرار شروع ہوا۔ اپنی بی بی کے مزاج سے کون نہیں واقف ہوتا۔ اس لیے میں نے کہا بھی کہ ابھی تو دو ایک ساڑیاں اور جوڑے بن پہنے رہ گئے ہیں جلدی کاہے کی ہے مگر ان کی ضد بڑھتی ہی گئی۔

یس ڈیئر اور وہ سبز پائپنگ والی شفن جارجٹ ساڑی اور نیاسٹ!

بی بی ڈیئر ہو گی۔ وہ ساڑی اور نیاسٹ۔ کوئی ہم سے چھین لے جائے گا! دیکھ رہے ہو یہ بن برسات کی برسات لگی ہے۔

بوتانات والی کوٹھڑی ساون میں کتنی ٹپکتی تھی۔ اور اناج یوں ہی ٹوکروں میں بھرا چھوڑ آئے ہیں ؟"

یہ نسوانی دلیل پائپنگ والی ساڑی اور نئے سٹ پر بھی غالب آگئی۔ اور ناچار ایک عنایت فرما کو معذرت کا خط بھی لکھنا پڑا کہ ہم لوگ سخت مجبوری میں گھر واپس جا رہے ہیں اور کل کے ڈنر میں نہ شریک ہونے کا ہم دونوں آدمیوں کو بڑا قلق ہے۔

میں "صرف جج صاحب کے یہاں جانا رہ گیا ہے۔ صبح ان کے یہاں ہوتے ہوئے مکان نکل چلیں گے۔

بی بی "ان کے یہاں جانا بہت ضروری ہے۔ نہیں تو بری اثر کا بات ہوگی۔ مگر زیادہ دیر نہ لگانا تم تو جہاں بیٹھ جاتے ہو اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے ہو۔

دوسرے دن صبح کو نو بجے ہم لوگ جج صاحب کے یہاں پہونچے خود جج صاحب تو تھے نہیں۔ مگر ان کے چھوٹے بیٹے اور جج صاحب کی بی بی تھیں۔ ایک مہمان بھی ٹھہری تھیں۔ تعارف ہوا باتیں ہونے لگیں یہ صاحبزادی ابھی ابھی آکسفورڈ سے واپس آئی ہیں۔ جج صاحب کے صاحبزادے اور یہ لوگ کمیونسٹک انداز کے لوگ ہیں۔ خیر پولیٹیکل خیالات سے اسوقت

نہ ہم کو دلچسپی ہے نہ ان جھگڑوں میں پڑنے کو دل چاہتا ہے۔
ہم تو کسی ایسے ستارے کی گردش میں پیدا ہوئے ہوں گے۔
جہاں عورت کا راج ہو گا ۔
دل ابھی تک جواں ہے پیارے :: ایک آفت میں جان ہے پیارے
ساٹھ برس کا سن عشرۂ قاتلہ کو پار کرنا کوئی بچوں کا کھیل
نہیں اور ہم ہیں کہ اُس کی بھی ہمت باندھے ہیں۔ بقول
نظیر اکبر آبادی کے ؎

اب بھی ہمارے آگے یار و جوان کیا ہے

اُن صاحب زادی سے تعارف میرا کرایا گیا کہ فلاں شخص
کے والد ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف لوگوں سے اس
طرح کروایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں فلاں کے داماد ہیں
اور اب یہ زمانہ لگا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے
سسرے ہیں، مگر ہم چکنے گھڑے ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا
کہ ہم وہ نہیں رہے۔
وہ صاحب زادی :۔ آپ سے مل کر بڑا جی خوش ہوا۔ (اپنے
میزبان کی طرف اشارہ کر کے) ان سے اور اپنے دوسرے
دوستوں سے آکسفورڈ میں اور یہاں بھی آپ کے لڑکے کی

بڑی تعریفیں سُنی ہیں۔ آج کل کہاں ہیں؟

میں:۔ جی ہاں۔ یقیناً لکھنو میں ہوں گے۔

صاحب زادی:۔ ہم لوگ اس وقت دریا کی سیر کو جا رہے ہیں۔ چلئے آپ بھی چلئے۔

میں:۔ میں توکل ہو آیا ہوں مگر چلئے ضرور چلوں گا (اپنی بی بی کی طرف مخاطب ہو کر) پھر اس وقت کا جانا ملتوی کر دو۔ شام کو چلیں گے۔

اناطول فرانس۔ میر تقی میر۔ ڈیلیسیگنز۔ فردوسی۔ رمبرآنٹ۔ سعدی۔ گوئٹے۔ ورڈزورتھ۔ روحیں میری مدد کو پہنچو۔ تمھارے اس ناچیز مرید پر بڑا سخت وقت پڑا ہے تم نے بڑے گاڑھے وقتوں میں میری مدد کی ہے۔ میری کمزور اُنگلیوں میں جنبش دو۔ میرے گھسے پسے قلم کو موقلم کا زور بخشو کہ اس گھڑی کی تصویر اُتار دے۔

ہماری کمسن بی بی نے کہا تو صرف "اچھا" مگر اُن کے چہرے پر اس مایوسی کی جھلک دکھائی دی جو ارادہ فسخ ہونے پر پیدا ہوتی ہے۔ فلسفیانہ تاسف کی مسکراہٹ نے زبانِ حال سے کہا "ہم نے تو ان کی صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا تھا کہ تم پھسل پڑو گے"۔ ماتھے کی خفیف شکن اور ابرو کی کمان نے کہا "تمھارے سن کی زیادتی سے

اور نیز اس وجہ سے کہ ہم سے محبت کرتے ہو اطمینان ہے کہ افلاطونی محبت سقراطی محبت تک نہ پہونچے گی۔ پھر بھی ہماری مسکراہٹ پر نہ جاؤ۔" آنکھوں نے یہ بھی کہا کہ اس وقت غیر جگہ نہ بیٹھے ہوتے تو رنگ دوسرا ہوتا۔ مگر تم پریشان نہ ہو۔ گھر پہونچکر بھی ہم لڑیں گے نہیں۔ عادت کے گھٹے پڑ چکے ہیں۔" ہونٹوں نے کہا "اور بات خدا لگتی کہنا چاہیئے۔ تمھاری بچوں کی ایسی باتوں پر ہنسی بھی تو آتی ہے کہ جہاں کسی نے چٹکی بجائی۔ تم گیگلے بچے کی طرح ہمک کر اُسی کی گود میں پہونچ گئے۔" گردن کے ڈورے نے ایک طرف پھر کر کہا "ارے تم شام کو بھی نہ چلو گے۔ ہم تو جانتے ہیں نا! خیر۔ دریا کی سیر ایک بار پھر ہو جائے گی، اور وہ پائینگ والی ساڑی اور نیا سٹ بھی سوارت ہو جائے گا۔ ہمارا ابھی تو ہاتھ نگوڑا پتھر کے نیچے دبا ہے۔ چلو یوں ہی سہی۔"

گالوں نے ٹھڈی کی مدد سے کر کہا "ہم بھی تو تمھارے پیار سے بے لبس ہیں۔"

بنگال کی شاخ کا چشمہ انگلستان کے پودے پر بندھا۔ منور ما اپنے ملک کو واپس آئیں۔ آکسفورڈ کے فرسٹ کلاس کے نیچے کبھی بات نہیں کی۔ ہندوستان آئیں جو دیکھتا ہے کہتا ہے "واہ واہ"

صورت شکل کوئی دنیا سے نرالی نہیں ہے۔ مگر وہ بات جس کو شیراز کے حافظ جی "آن" کہا کرتے تھے۔ ہر چیز سے پیدا ہے۔ کچھ ناگن کی سی چال۔ کچھ برق تمثال۔ کچھ پھول کچھ کلی آدھی بند آدھی کھلی چاندنی کی سی بے تکلفی۔ علم کی خود اعتمادی، کمیونسٹ فلسفے کی بنا پر برابری کا دعویٰ خود نسوانیت کے حقوق نہیں مانگتی تھیں۔ مگر مردوں میں کچھ ایسا رومانی اثر پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر شخص خراج تحسین لئے حاضر ہے۔ آنکھوں سے باتیں کریں ہنسی سے خوشی پیدا ہو۔ ہونٹوں کی جنبش میں پسندیدگی ناپسندیدگی........ گال ناک ماتھا مسائل حل کر رہے ہیں۔

نہ گفت و من بشنیدم ہر آنچہ گفتن داشت

کہ در میاں نگہش کرد بہ زبان تقدم

دہاں چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت

فتاد سامع در موج کوثر و تسنیم

میرے پڑھنے والو معلوم نہیں کہ تم میرا مضحکہ اڑاؤ گے یا خود اپنے آنے والے بڑھاپے کا خیال کر کے عبرت بلد پیشگی کرو گے۔ مگر ہم تو کھیت رہے۔ انا للہ ناشِ و انا الیتن راجعون۔ کہاں کی واپسی اور کیسا رخت سفر۔ اس وقت جاتے ہے تو اُس وقت بیٹھا ہے۔ سیر ہے تفریح ہے۔ نہ شتہ در گرد نم افگندہ دست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست۔ ایک کوئی ہمارے ہی ایسے
اگلے زمانے میں بھی گذرے ہیں خالی وہ جوان تھے ہم تجربہ کار ہیں۔
شحنۂ عشق ان پہ بھی ہماری ہی طرح سوار تھا۔ وہ بے چارے جنگل
جنگل اپنی معشوقہ کا نام لیتے پھرتے تھے اور نعرے لگاتے تھے کہ "آہ حسینہ
میری نیند اُڑا نے جانے والی" مجھ کو راتوں کو جگانیوالی" انکا خدمتگار بھی ساتھ
ساتھ تھا۔ دبی زبان وہ بھی کہتا جاتا تھا "میری بھی نیند اڑا لے
جانے والی۔ مجھ کو بھی راتوں کو جگانے والی" یہی حال ہماری بیگم صاحب
کا تھا کہ وہ بھی کچھ ہنسی کچھ غصہ زبان حال سے وہی خدمتگار والی
باتیں فرماتی تھیں۔ گو تجربے کی بنا پر ان کو اطمینان تھا۔ پھر بھی ڈر ل نہ
اڑ جائے کہیں دام سے تیرے صیاد۔ گرچہ پَر مردہ ہے یہ صید و لے طیر تو
ہے" عمر بھر کے ساتھ کا وعدہ خدا کے سامنے رسول کے سامنے پنچ برادری
کے سامنے کر چکی تھیں۔ بھلا ایسے وقت میں ایک باؤلے کو بغیر رسی
کے یوں ہی کیسے چھوڑ دیتیں۔ صبح کی گاڑی تو چھوٹ ہی چکی تھی۔
شام کی گاڑی گئی۔ اب دوسرے دن کا یاترا ب رکھا گیا۔ مگر منورما
بولیں "کمیونسٹ پارٹی کی ماہوار کمیٹی کل ہوگی۔ ہم تم کو بھی ممبر کرنا
چاہتے ہیں اس کے بعد چلو تو ہم بھی لکھنؤ جائیں گے۔ تمھارے گھر
رہئے۔ بریلی تک ریل پر بھی ساتھ رہے گا" میرا تو ذکر ہی کیا مگر منورما

کی وجہ سے صحبتیں کچھ ایسی دلچسپ ہو گئی تھیں کہ خلاف اُمید میری بی بی بھی ایک دن اور ٹھہرنے پر راضی ہو گئیں۔ عموماً ان جلسوں میں ایک ہم ہی مُسن ہوتے تھے۔ ورنہ عورت مرد سب وہی تھے جن میں اُمنگ۔ جوانی۔ تہیہ۔ ارادہ۔ ہمت۔ آئندہ کی اُمیدیں موجود۔ مختصر گزشتہ قریب قریب مفقود۔ ان صحبتوں میں ہر فرد پڑھا لکھا زیادہ تر دو ہی قسم کی باتیں ہوتی تھیں یا قربانی۔ خدمت۔ کارل مارکس کے اصول کی بے دھڑک پابندی۔ ہتھیلی پر جان لے کر کام کرنے کی، یا کھلے ڈلے جنسی طلسمات دونوں قسموں میں جوش قدرِ مشترک۔ کیا کہنا جوانی کا، اصول اخلاق کی نئی دلآویز تفسیریں، جوانی کے خواب کی نئی تعبیریں۔ جنس کے دنیا ساز قیود ٹوٹے پڑے تھے۔ البتہ فطرت کی حفاظتیں مجبوراً برقرار تھیں۔ مساوات نے عورت مرد کا فرق کم کر دیا تھا۔ اگر کسی نے کسی لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ جھجکی نہیں۔ اگر کوچ پر کوئی کسی سے بھڑ کر بیٹھا تو تعجب نہیں۔ تھوڑی بے تکلفی اور بڑھ گئی تو کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئے۔ یہ باتیں دیکھ کر ہماری بی بی کی آنکھیں کھُل گئیں ؎

بیٹھے بیٹھے کچھ مزا ہم کو بھی اب آنے لگا

اب تو ہم بھی دردِ دل میں مبتلا ہونے لگے

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ بے جھجک اس میدان میں آگئیں
مگر شعورِ باطن ان کا بھی کمیونسٹ ہی ایسا معلوم ہوا۔
بجائے اُن کے اب ہم گھر کی واپسی کے منصوبے باندھنے لگے۔
ہماری بیگم بھی کمیٹی میں شریک ہوئیں ناواقف کاری کی
وجہ سے زیادہ حصہ تو نہ لے سکیں۔ مگر بہت ذہانت اور
دلچسپی سے جلسے کی کارروائی سنا گئیں۔ گھرے مسائل تک
تو شائد نہ پہونچی ہوں مگر دبی زبان سے اتنا تو کہا کہ جب
مرد ایک سے زیادہ شادی کرتے ہیں تو عورت بھی اپنا یہ حق
کیوں نہ لے۔ ناظرین ہم نے واپسی کا ارادہ مصمم کرلیا۔ آج
پہلے پہل شام ہم نے اپنی قیام گاہ ہی پر بسر کی اور رات
وہی اپنے ستارے کی گردش کے اثر سے بیگم اور منوّرما
کے منصوبوں میں گزاری۔ صبح کو ریل پر منوّرما کا آخری مرتبہ
ساتھ ہوا۔ دریا کی سیر میں منوّرما نے کچھ تصویریں احباب
کی اتاری تھیں وہ دکھائیں۔ ہم نے اپنے چہرے کی شکنیں دیکھ کر
اللہ کا شکر بھیجا کہ آدمی خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اسی
کے ساتھ ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ باوجود چہرے پر اُلّو کے

ہمارے دل کو تصویر سے ایک تشفی سی بھی ہوئی اسٹیچو ہو کہ تصویر ہو اولاد ہو کہ تصنیف ہو جہاں اس فنا کے چھیڑے کو کسی نہ کسی صورت سے کچھ دن اور بھی دُنیا میں رہنے کی آس ہوئی۔ دل خوش ہی ہو جاتا ہے۔

لیجئے صاحب راستے بریلی کا اسٹیشن آگیا۔ ہم ہاتھ ملا کر ریل گاڑی سے اُترے۔ ہم نے اپنے دل میں کہا "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"۔ اب یہ موہنی صورت پھر کاہے کو دیکھنے میں آئے گی۔

منورما:۔ آپ اپنے لڑکے کو کچھ پیغام تو نہ دیجئے گا۔ کیونکہ کل کمیونسٹ جلسے میں اُن سے ملاقات ضرور ہو گی۔ وہ تو لکھنؤ کی کمیٹی کے سکریٹری ہیں نا؟"

میں:۔ جی اسے تو کچھ کہنا نہیں ہے۔ مگر آپ سے ایک درخواست ہے۔ اگر ہو سکے تو ہمارے لڑکے ہی پر عاشق ہو جائیے گا۔

منورما:۔ میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتی مگر کوشش کروں گی۔ ختم

اس مضمون کی تنقید خود مصنف کے قلم سے۔ ڈاکٹر جانسن نے بادشاہ جارج سے کہا تھا کہ نئی باتیں آدمی صرف تیس سال تک سیکھتا ہے۔ اس کے بعد اُسی پر اپنے علم کی جانچ۔ رگڑ تگڑ ہوا کرتی ہے۔ چمک صفائی زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن چیز وہی رہتی ہے۔ بارنرڈ شا نوے سال سے اوپر کے ہیں۔ ان

کے عنفوانِ شباب کے ناول دیکھئے، جو انی کے ڈرامے دیکھئے، جو بچک، جو شفافی، وہ آخری ڈراموں میں ہے اس پر عش عش کیجئے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو پتا چلتا ہے کہ وہی اگلے برس کی تیلیاں ہیں۔ خالی اوپر کی جگمگاہٹ، رونق اور ٹھاٹھ دلآویز ہے۔ نئی بات بڑھاپے میں کہاں جو کچھ ہے وہی غنیمت ہے۔ جب بارنرڈ شا کا یہ حال ہو تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ لہٰذا امید ہے کہ تنقید کرنے میں بوڑھے کا دل رکھ لیجئے گا۔ بقول رسکن کے تصویر میں "یہ نہ ڈھونڈھو کہ کیا نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہو اُس کی تعریف کرو"۔ اس نظریئے سے اگر دیکھا جائے تو مصنف کا نڈر انداز اور ریلزم قابلِ داد ہیں ؂

پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

"مس ہیلن"

مس ہیلن دولت مند تھیں۔ اپنا وطن چھوڑ کر اس غلامستان کو اپنا دیش بنایا تھا۔ خود کہا کرتی تھیں کہ ہندوستان میرا روحانی وطن ہے ہندوستانیوں سے برابر کے طور پر ملتی تھیں۔ یہ بات اُن کے ہم قوموں کو یقیناً گراں گذرتی رہی ہوگی۔ مگر وہ پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ انگریزوں کی قوم پرستی ضرب المثل ہے۔ مگر تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے جب یہ ہندوستانیوں پر اس طرح سے فدا تھیں تو ان کی قوم والے بھی ان سے دور کی صاحب سلامت کافی سمجھتے تھے۔ انگریزوں میں سوسائٹی کے قوانین اتنی سختی سے برتے جاتے ہیں کہ اگر کوئی اُن کی پرواہ نہیں کرتا تو اُسکی نسبت دُنیا بھر کی بُرائیوں کا گمان کیا جاتا ہے۔ دماغ کی خرابی جنسی جرائم کی عادت وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی نے بڑا احسان کیا تو صرف یہی شک کیا کہ شائد دل ٹوٹ چکا ہے۔

مس ہیلن کی نسبت اُن کے ہم قوم اپنی نیک دلی سے کام لے کر صرف یہ کہتے تھے کہ دماغ میں کسی جگہ کوئی کیڑا ہے جو اُن کو اعتدال کے مرکز سے ہٹائے ہے۔ شروع شروع ہندوستانی اُن میں کوئی عیب ہی نہیں پاتے تھے۔ اُن کا اخلاق۔ اُنکی نیک دلی۔ چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں پر ان کی درگذر اور اُن کا اصلی کام یعنی ہندوستانیوں کو خوددار بنانے کی کوشش قصہ مختصر ہر

بات اُن لوگوں کو اچھی ہی اچھی دکھائی دیتی تھی۔ انگریزوں اور ہندستانیوں کی رائے تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ اب رہے داستان گو۔ اُن کے خیال میں مس ہیلن میں بھی اسی طرح کا ایک عیب تھا جیسے چاند میں دھبے۔ مگر وہاں اُن سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور یہاں بھی ایک عیب سب کام بگاڑے تھا وہ یہ کہ جوان تھیں۔ دُنیا میں کام کرنے کے لیئے دولت اکثر ضروری ثابت ہوئی ہے خوبصورتی نے کبھی کبھی بڑے فائدے پہونچائے ہیں۔ کبھی بڑے بڑے نقصان مگر جوانی ہمیشہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکاتی ہے مس ہیلن میں جوانی تھی۔ دولت کافی سے زیادہ تھی خوبصورتی کا یہ حال تھا کہ بعضوں کے نزدیک اُن کی یونانی ہمنام نے اُن میں جنم لیا تھا۔ بعضوں کے نزدیک اُن کا قد بہت کشیدہ تھا۔ اُن کی ٹھوڑی اور ناک بہت نمایاں تھیں۔ اور اُنکی ہنسی میں رونق نہیں تھی۔ لکھنے والے کے نزدیک اُن کے قد کی بُرائی صرف وہ لوگ کرتے تھے جو خود لمبے نہیں تھے اُن کی ٹھوڑی اور ناک اُن لوگوں کو بُری لگتی تھی جنھوں نے روم کی سنگی تصویروں پر غور نہیں کیا تھا۔ ہنسی کو بے رونق وہ لوگ بتاتے تھے جن کا مذاق پسند ایک عورت پر ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

جہاں تک پتہ چلتا تھا مس ہیلن کبھی دردِ دل کی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئی تھیں اوّل تو اُنھوں نے زندگی کا ایک مقصد بہت سختی سے اختیار کر رکھا تھا دوسرے کچھ سرد مہر واقع بھی ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے کلب کے ممبران

الف۔ بے۔ ج۔ د۔ ہ سبھی سے نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتی تھیں۔ اور جنسی معاملات پر اس طرح گفتگو کرتی تھیں جیسے مولوی لوگ مذہبی کتابوں کے جنسی مسائل پڑھاتے ہیں۔ اس طرح کی گفتگو شروع ہوتی تھی تو نوجوانوں کے دلوں میں اُمیدوں کا طوفان بندھتا تھا۔ جب ختم ہوتی تو بحث کرنے والوں کو بُور کے لڈو یاد آجاتے تھے جن کی نسبت مشہور ہے "جو کھائے وہ پچھتائے جو نہ کھائے وہ پچھتائے"۔ مثال کے طور پر دو ایک مکالمے سُن لیجئے:۔

مس ہیلن۔ ہندوستانی اپنی بیویوں کو نہیں چاہتے۔

الف۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔

مس ہیلن۔ اسلیئے کہ ہم راستے میں اکثر دیکھتے ہیں کہ عورتیں بڑا سا بوجھ اور لڑکا سا لئے چلی جاتی ہیں۔ اور مرد کوئی ہلکی سی چیز سنبھالے ہے۔

الف۔ یہ تو اس وجہ سے ہے کہ آپ نے اُس بوجھ کی بڑائی دیکھ لی ہے اگر اُن کی گٹھریاں کھول کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ عورت کی گٹھری میں صرف کپڑے اور دوسری ہلکی چیزیں ہیں۔ اور مردوں کی پیٹھ پر پھول کے برتن اور آٹا وغیرہ بندھا ہے۔ اور پھر آپ کو کیا معلوم کہ وہی عورت جو سڑک پر بوجھ لادے چلی جارہی ہے گھر کی چہار دیواری کے اندر اپنے میاں پر چڑھی نہیں لیتی اور انگنائی بھر میں چکر پھیریاں نہیں لگاتی۔

مس ہیلن۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر دوسری باتوں میں ہندوستانی مرد عورت کو

ذلیل نظر سے دیکھتا ہے۔

الف۔ عورت کا درجہ ہمارے یہاں مرد سے بہت نیچا رکھا گیا ہے اور جن قوموں میں عورت کی قدردانی کے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں وہاں بھی عورت کے حقوق مرد سے بہت کم تھے اور آج بھی ہیں۔

مس ہیلن۔ جو قومیں دو دو تین تین بیویاں رکھتی ہیں وہ عورت کی قدر کا دعویٰ کیونکر کر سکتی ہیں۔

الف۔ بقول برناڈ شا کے اگر عورت عمدہ مرد میں چار آنے کا حصہ کسی خراب مرد میں سولہ آنے کا حصہ رکھنے سے زیادہ پسند کرتی ہے تو کیا ہرج ہے۔ اسکے علاوہ عورت یکخصمی واقع ہوئی ہے اور مرد ہرجائی کہلاتا ہے۔

مس ہیلن۔ تم یہ کیونکر کہہ سکتے ہو کہ عورت ایک ہی وقت میں کئی مردوں کی خواہش مند نہیں ہوتی۔ تم تو مرد ہو۔ یہ بات تو عورت ہی تبلا سکتی ہے۔

(۲)

مس ہیلن۔ تم فلاں عورت کو جانتے ہو۔

ب۔ نام سنا ہے۔

مس ہیلن۔ میں تم کو بتاؤں اس عورت میں جنسی گرمی بہت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا شوہر اتنا مضمحل نہ رہتا۔

ب۔ دونوں جوان ہیں تندرست ہیں یہ کیفیتیں تو زیادہ سن والے کو ہوتی

ہیں۔ میرے خیال میں اس کے چپ رہنے کی کوئی اور وجہ ہوگی۔

مِس ہیلن۔ میں اس وجہ سے کہتی ہوں کہ مجھ سے اس مرد سے شادی کے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ بلکہ ایک شام کو وہ مجھ کو سینما بھی لے گیا تھا۔ اور اندھیرے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مگر میری تربیت دوسری طرح کی ہوئی ہے اسلئے میں نے اُسکی جرائتیں بڑھنے نہیں دیں۔

ب۔ مس ہیلن۔ آپ کی ایسی خوبصورت عورت کے پاس بیٹھ کر اگر کسی غریب کا پاؤں ڈگ جائے تو آپ کو چاہیئے کہ اُس کو قانونی سزا دیکر مراحم خسروانہ میں معاف کر دیجئے۔

مِس ہیلن۔ ہنس کر۔ میرا اس نے کیا بگاڑا جو میں اس سے خفا ہوتی مگر ایسی عورت کے ساتھ شادی کر کے اُس نے اپنی زندگی تباہ کر دی۔

ب۔ اگر وہ دونوں راضی ہیں تو تیسرے آدمی کو اعتراض کا کوئی حق معلوم نہیں ہوتا۔

مِس ہیلن۔ میں تم سے بالکل اتفاق کرتی ہوں۔ مگر تم اُس عورت کی قطع دیکھتی ہو۔ کمر گولے اتنے بھاری سینہ اتنا بڑا۔ پاؤں میں مردوں کے ایسے بال اور ساڑھے آٹھ نمبر کا دستانہ پہننے والی بھلا تمھارے خیال میں اُس کا کیا سن ہوگا۔

ب۔ میرے خیال میں چوبیس برس انتہائی پچیس برس۔

مِس ہیلن۔ پچیس برس۔ غضب کیا تم نے۔ میرے خیال میں ۳۵ برس سے ہرگز کم

نہیں ہے۔ بلکہ چالیس برس میں تو کہونگی کہ اگر وہ ۴۵ کے لگ بھگ ہو تو تعجب نہیں۔ میں اسوجہ سے بھی کہتی ہوں کہ کم سنی میں مرد کا شوق عموماً کم ہوتا ہے جوں جوں سن بڑھتا جاتا ہے بعض عورتوں کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔

(۳)

مس ہیلین۔ تم فلاں شخص کو جانتے ہو۔

ج۔ جانتا ہوں مگر زیادہ واقف نہیں ہوں۔

مس ہیلین۔ مجھ سے اس شخص سے بڑی دوستی تھی۔ اس نے جس وقت میری ایک جاننے والی سے مری بڑی سخت برائی کی مجھ کو اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ یہ شخص میرے ایک دوست کے یہاں مقیم تھا۔ اسنے اسکی لڑکی کو خراب کیا۔ اور یہ حال اسوقت کھلا جب وہ لڑکی بیماری کی وجہ سے ہسپتال پہونچ گئی۔ لوگوں کو خیال تھا کہ اُس کو اُس شخص نے ایک جنسی بیماری دیدی ہے مگر امتحان کے بعد یہ خدشہ غلط ثابت ہوا پھر بھی اُس کو ایسا نہیں کرنا تھا۔

ج۔ میرے خیال میں ایسے معاملات میں کچھ نہ کچھ ذمہ داری دوسرے فریق کی بھی ہوتی ہے۔

مس ہیلین۔ تم کو اس بدنصیب لڑکی کا سن نہیں معلوم ہے ورنہ تم ایسا نہ کہتے جس وقت کا یہ واقعہ ہے وہ صرف ۱۸ یا ۱۹ سال کی تھی۔

ج۔ ۱۸، ۱۹ سال کا سن اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے یعنی میرا مطلب

یہ ہے کہ اس سن میں اکثر واقعات اس طرح کے سُنے گئے ہیں۔
مِس ہیلین ۔ ممکن ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیونکہ اس لڑکی کی تربیت بھی اچھی نہیں کہی جاسکتی تھی۔ اس کی ماں کو اسکا باپ بہت دن ہوئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مگر میرے پاس اُس شخص کے بُرے ہونے کا ایک اور بھی ثبوت ہے مسٹر ٹیسن کے یہاں وہ ڈنر اور ناچ تم کو یاد ہوگا میں نے اپنی کار وہاں پہونچ کر واپس کر دی تھی۔ کیونکہ میرا شوفر اسوقت چھٹی لے چکا تھا۔ واپسی میں اس شخص نے مجھ کو گھر پہونچا دینے کا وعدہ کیا۔ راستہ میں اس نے میرا بوسہ لینے کی کوشش کی۔
ج ۔ مس ہیلین ۔ اُس رات کے لئے تو میں اُس کی وکالت کرونگا۔ آپ کے کپڑے اور سنگار نے آپ کا حُسن ایسا چمکا دیا تھا کہ اگر کسی دوسرے کے عزم و استقلال میں فرق آجاتا تو قابل معافی تھا۔
مِس ہیلین ۔ (ہنسکر) نہیں میں نے خود غلطی کی تھی۔ میں تین مرتبہ اُس کے ساتھ ناچی تھی یہ مُجھ کو نہ کرنا تھا۔ پھر بھی اُس کو آدمی پہچان لینا تھا۔

(۴)

د ۔ مس ہیلین ۔ آداب عرض کرتا ہوں۔
مس ہیلین ۔ پرسوں میں نے آپ کو مس "ن" کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیا آپ کی نظر میں وہ خوبصورت ہے۔

د ۔ میری نظر میں تو ہر عورت خوبصورت ہے اور مس "ن" کو مستثنیٰ نہ کرنے کی
میرے پاس ایک بڑی وجہ موجود ہے ۔
مس ہیلن ۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر قد اُس کا ذرا سا چھوٹا نہ ہوتا تو واقعی
اچھی تھی۔ سوا بالوں کے جو اتنے نیچے سے جمے ہیں کہ ماتھا چھوٹا ہو گیا ہے۔
د ۔ مجھ کو تو چہرے بھر میں جتنا اس کا ماتھا پسند ہے کوئی دوسری چیز مشکل سے
پسند ہو گی۔ اسی وجہ سے میں نے پیغام بھی دیدیا اور قبول بھی کر لیا گیا۔ میں
اپنے کو مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں ۔
مس ہیلن ۔ ضرور ضرور خدا مبارک کرے میں نے جو رائے ظاہر کی تھی وہ
صرف ایک کرٹیک کی نظر سے کی تھی ورنہ بحیثیت تمھاری منگیتر کے وہ سوا اچھی
کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہماری چھوٹی سی سوسائٹی میں مس ... سے خوبصورت
کوئی نہیں ہے تم نے اُس کے ساتھ شادی کیوں نہ کی۔
د ۔ ہر شخص کا مذاق مختلف ہوتا ہے اور دل کے معاملات سوائے صاحب
معاملہ کے دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ اچھا اب خدا حافظ میں جاؤں گا۔
مس ہیلن ۔ میری مبارکباد دوبارہ قبول کیجئے۔
د ۔ شکریہ ۔

(۵)

مس ہیلن ۔ آہا مسٹر "ہ"، آج آپ سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی میں

سمجھتی تھی کہ آپ کو میری صحبت بہت پسند ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اب میری جگہ مس "د" نے چھین لی ہے۔

"ک"۔ (قہقہہ لگا کر) آپ ایسا ہرگز نہ سمجھئے میں آپ کا اسی طرح خالص نیازمند ہوں جیسا ہمیشہ رہا ہوں۔

مس ہیلین۔ تمھارا انداز مجھ کو سب سے پسند ہے۔ وہ یہ کہ تمھاری باتیں کھلی ڈلی صاف دلی کی ہوتی ہیں جن میں ڈورے ڈالنے کا انداز نہیں ہوتا۔ اگر تم کو ایک نئی خبر سناؤں تو کیا دوگے۔

"ک"۔ پہلے خبر سنا دیجئے تب بتاؤں گا۔

مس ہیلین۔ "د" نے مس "ن" کے ساتھ پیغام دے دیا اور قبول بھی ہو گیا

"ک"۔ ارے یہ تو تازہ سے تازہ خبر نہیں کہی جا سکتی۔ میں نے تو یہ کئی دن ہوئے سنا تھا۔

مس ہیلین۔ میں نے تو آج ہی سنا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر "د" اُس میں کون بات دیکھتے ہیں۔ اس تین سال کے اندر ۵-۶ آدمیوں کو تو میں جانتی ہوں جو خلا ملا کر کے علیحدہ ہو گئے پہاڑ پر جو محبت کرنے والے رہے ہوں اُن کی گنتی نہیں۔

"ک"۔ یوں تو وہ ہر شخص سے ہنسکر ملتی ہے مگر اتنے زیادہ مراسم پہلے شاید کسی سے نہ ہوئے ہوں۔

مس ہیلین ۔ میں دیکھتی ہوں کہ مسٹر "ہ" آپ بنیاد سے اتنے باخبر نہیں جتنا کہ میں سمجھتی تھی ۔ میں تم سے بصیغہ راز دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس عورت کا کنوار پن برسوں ہوئے جاچکا ہے اور گذشتہ سال یہ ایران وغیرہ جو گئی تھی ممکن ہے کہ اس کے لئے اشد ضرورت رہی ہو۔

الف ۔ ب ۔ ج ۔ د ۔ ہ

الف ۔ بھئی مس ہیلین کا ذکر نہ کرو اور جو جی چاہے کہو۔ اس عورت کے سامنے تو میرے اعصاب میں کھنچاؤ سا ہونے لگتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ کمرہ چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

ب ۔ ہر شخص کا یہی حال ہے مگر اس کی ہندوستانی دوستی میں شک نہیں اور اس لحاظ سے ہمیں اس کا احسان ماننا چاہیئے۔

ج ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی میں ایک صفت ہے لوگ اُس کے دوسرے عیوب سے پریشان نہ ہوں۔

الف ۔ ارے بھئی اس کی تو یہ حالت ہے کہ پہلے دوسرے جنس کو للچاتی ہے اس کے بعد سرد مہری کر کے اُس کو خفیف کرتی ہے اور لوگوں سے واقعات بیان کرتی ہے کہ میں ایسی پاکباز ہوں

ب ۔ اگر الف صاحب خود اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہتے ہیں تو ہم کو تسلیم ہے۔

الف۔ (ہنسکر) خیر میں اگر اپنی بیتی کہتا ہوتا تو شاید اس صفائی سے باتیں نہ کر سکتا۔ مرد کو جانے دیجیے خود اپنی جنس کی جانی دشمن ہے۔ یہ تو میرا تجربہ نہیں ہو سکتا۔

د۔ نہیں نہیں میں نے مس ہیلن کو ایک عورت کی بھی تعریف کرتے نہیں سنا ہے۔ خالی ساٹھ برس سے کم سن والی میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتی۔

ج۔ میں عرض کروں۔ یہ سب خرابی اس وجہ سے ہے کہ اس نے شادی نہیں کی۔ اچھی خاصی عورت ہے مگر فطرت سے لڑ کر کون جیتا ہے جو یہ غریب کامیاب ہوتی۔

دہ۔ ،، جنسی تقاضے کو آدمی خیرات۔ خدمت خلق۔ فنون لطیفہ کی ترقی کی طرف پھیر سکتا ہے اور اس میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔

د۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اس مسئلہ کے ہم بھی قائل ہیں۔ مگر جنسی قوت سے بھرپور دوسرا کام لینا اور اس کو بالکل محروم رکھنا شاید اس فلسفے کے موجد کا بھی یہ دعوی نہ ہو۔ یہ مسئلہ صرف نفسیات ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جسم سے بھی متعلق ہے ایسی حالت میں صرف یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑا سا اس سے فطرتی کام لیا جائے اور باقی دنیا کے فائدے کے لیے دوسروں کے کام آوے اگر سر سے پاؤں تک اس سے یہی کام لیا جاوے گا تو یہی نتیجہ ہوگا جو پیش نظر ہے یعنی عورت مرد سے واسطہ نہ رکھے گی۔ مگر

لوگوں کو للچا للچاکر خود بھی پریشان ہوگی اور دوسرے کو بھی پریشان کیا کرے گی۔

ب۔ تو یہ بھی ایک قسم کی ہسٹریا ہے جس میں غلط بات پر ارادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔

د۔ اور نہیں تو کیا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ایسی عورتیں جہاں دو آدمیوں کو محبت کرتے دیکھتی ہیں صرف پریشان ہی نہیں ہو جاتیں بلکہ اس غریب عورت کے عیبوں کو ڈھونڈنے لگتی ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتی کہ خود اپنی محرومی دوسرے کے عیبوں کو روشن کئے ہوئے ہے۔

بات سمجھ میں تو آتی ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ مس ہیلن فنون لطیفہ کی ماہر اور بڑی خوش مذاق ہے اس کی تنقید کچھ پایہ رکھتی ہے۔

اس کے روشن خیال ہونے میں کچھ شک نہیں مگر آپ نے سُنا نہیں کہ تنہا منشیں کہ خوف دیو انگی است" انھوں نے فطرت سے جو اعلان جنگ کر رکھا ہے وہی سب کھیل بگاڑے ہے چاہے وہ نقادی کی نظر ڈالیں چاہے وہ بحیثیت ایک ماہر اخلاق کے کسی کے چال چلن کی پرکھ کریں۔ ہر چیز میں خود اُن کی خالی خولی زندگی کھیل بگاڑ دیتی ہے جس سے دوسروں کے عیوب چمک اُٹھتے ہیں اور ہنر چھپ جاتے ہیں۔

(اتنے میں مس ہیلن جاتی ہیں۔)

"ک" آیئے آیئے مس ہیلن ابھی آپ ہی کا خیال دلمیں تھا کہ آپ آگئیں۔ ہندوستانی عقیدے کے موافق آپ بہت جئیں گی۔

الف۔ مس ہیلن آپ کا ایسا کپڑوں اور زیور کے انتخاب کا سلیقہ سب عورتونکو ہو جائے تو ہم غریب مردوں کی نگاہ اور دماغ دونونکا سکون بڑھ جائے۔

مس ہیلن۔ آپ دونوں آدمی ایک سے ایک بڑھ کر بادشاہ کی مصاحبت کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں اچھا اب آپ لوگوں کو ایک نئی اطلاع دیتی ہوں۔ وہ یہ کہ عنقریب انگلستان واپس جانے والی ہوں"

الف۔ یہ خبر تو آپ نے ایسی سُنائی کہ ہم لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

د۔ بھئی کلب کی طرف سے آپ کا رخصتی ڈنر بڑی دُھوم سے ہونا چاہیئے۔

یہ تو "د" کی زبان نے کہا مگر اُن کی آنکھیں۔ ہونٹھ۔ چہرہ بشرہ کہنے لگے۔ کیونکہ ایسی خوش قسمتی کے مواقعے زندگی میں بار بار نہیں آیا کرتے۔

اندر سبھا کی امانت

ہم اودھ والوں کو اندر سبھا سے ایک دلی تعلق ہے جس کو ہم خود سمجھ نہیں سکتے۔ کوئی ناچ گانے کو ہی گناہ سمجھتا ہے کسی کو اندر سبھا کا پلاٹ نہیں پسند ہے کوئی امانت مرحوم کے دیوان سے مقابلہ کر کے کہتا ہے کہ اندر سبھا کی زبان بازاری ہے کوئی اشعار سیٹھے پھیکے بتاتا ہے۔ مگر اندر سبھا کی جگہ ہم سب کے دل میں ہے اگر کسی کی سمجھ میں آسکے تو وہ اس واقعہ سے سمجھ لے کہ گلفام کا پارٹ ہمارے اودھ کے آخری بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کیا کرتے تھے۔ عورتیں اُن کو جانعالم کہا کرتی تھیں اور مرد جہاں پناہ کہتے تھے اندر سبھا دیکھنے والے کہتے تھے کہ واہ! گلفام ہو تو ایسا تو ہو جب لیجئے بات میں بات نکلتی ہے کہانی کے درمیان ایک اور کہانی سُن لیجئے۔

پہاڑوں کی راہ کٹھن ہو گئی تھی۔ سرد ہوا تیر کی طرح پار ہوتی تھی۔ اور گذشتہ شور ماؤں کی نگہبان کرنے والا بہت بوڑھا تھا اُس کی سفید کاکلیں اور نازک زرد چہرہ بتا دیتے تھے کہ اُس نے سکھ کے دن بھی دیکھے ہیں۔ اس کی بچی کھچی کائنات اس کا تانبورہ ایک لڑکا کاندھے پر رکھے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ یہ بدنصیب اُن

لوگوں کا آخری شخص تھا۔ جو سرحد کے جانبازوں کی بہادری کے گیت گاتے تھے۔ زمانہ بدل گیا پُرانی باتیں خواب ہوگئیں۔ اب ایک اور شخص قدیم بادشاہوں کے تخت پر بیٹھا تھا موجودہ زمانے کے کٹر لوگوں نے اُس غریب کے بے ضرر لطیف فن کو گناہ ٹھہرایا تھا۔ اُنھیں تلوار کے دھنی لوگوں کی ایک نام لیوا ایک سن رسیدہ امیرزادی تھی۔ جو اس کی قدردان تھی۔ نہ معلوم کون اُمیدیں لے کر یہ اُسی کے دربار میں پہونچا اسلحہ سے سجا ہوا دربار کا کمرہ دیکھا گذرا ہوا زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ مگر برسوں کی چھوٹی ہوئی مشق سے اُنگلیاں مفلوج تھیں۔ اور آواز غم اور مصیبت سے بھرائی تھی۔ عزت کی جگہ بٹھایا گیا مگر گاتے نہ بنتا تھا۔ امیرزادی نے دلاسا دیا اور دل بڑھایا کہ اتنے میں نہ معلوم کب کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ جیسے جوانی واپس آگئی۔ اس نے پھر اُسی قدیم آن سے اس امیرزادی کے بزرگوں کے گیت گانے شروع کئے جس میں سرحد کے بہادر تیر۔ تلوار اور نیزوں سے کھیلتے تھے اور جان کی بازی لگاتے تھے۔"

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جس کا مطلب بعد کو نکلیگا۔ اب اصلی کہانی سنئے تھوڑے دن اُدھر تک۔ ٹونکی کی بدتمیزی اور سینما کے راج کے پہلے اندرسبھا کی کمپنیاں جگہ جگہ قائم تھیں۔ اور صوبے بھر میں دورہ کرتی پھرتی

تھیں۔ اُن کو دیکھ کر اودھ والے اسی طرح متاثر ہوتے تھے جیسے والٹر اسکاٹ کی بوڑھی امیر زادی اپنے ملک کے پُرانے گیت سُنکر ہوتی ہو گی۔ جن لوگوں نے سلطانِ عالم کا زمانہ دیکھا ہو گا اُن کا ذکر نہیں۔ جو لوگ بعد کو آئے وہ کیوں متاثر ہوتے تھے جو کچھ اچھا رہا ہو گا وہ اُنھوں نے دیکھا نہیں۔ جو سُنا ہو گا وہ دلخوش کن نہ تھا۔ پھر یہ دل پر چوٹ کیوں لگتی تھی۔ اس ڈیماکریسی (Democracy) بلکہ سوشلزم (Socialism) اور کامیونزم (Com-munism) کے زمانہ میں دل کی بات کہہ کر کون اپنے کو ہنسائے۔ جو ان نمک لوگوں میں بوڑھا کہلائے مگر تاب نہیں ہوتی۔ کہے دیتا ہوں کہیں ان کے نمک کا اثر نہ رہا ہو۔

داستان گو صاحب آپ واقعی سٹھیا گئے ہیں نمک کی آپ نے خوب کہی نمک ملک میں پیدا ہوتا تھا کوئی اُن کے باپ کا تھا۔

لے ہے میرا مطلب آپ نہیں سمجھنے خیر ہو گا جانے دیجئے کہانی سنئے اس کہانی کے ہیرو بھی اندر سبھا کے سیکڑوں گلفاموں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے میں ٹکٹ وغیرہ کا رواج کم تھا۔ اس کے بجائے یہ ہوتا تھا کہ جو ار یا شہر میں جس رئیس نے چاہا تماشہ کروا لیا۔ اور دیکھنے والے بے روک ٹوک کے جمع ہو گئے۔ جب کہیں سے مانگ نہ آئی تو مشق کے لئے یا دل کے تقاضے سے یہ لوگ خود ہی تماشہ کرتے رہتے اور ارد گرد کے عورت مرد مفت تماشہ

دیکھا کرتے۔ روپ بھرنے کے آج والے طریقے کہاں تھے کہ ایکٹر دانت توڑوا ڈالیں اور مختلف ساخت کے جوکے بنوالیں جس سے صورت بدل جایا کرے اُس زمانے میں روپ تو ضرور بھرتے تھے مگر قدرتی صورت کی محتاجی آج سے زیادہ تھی۔ اس وجہ سے گلفام ایسا آدمی تجویز کیا جاتا تھا جو اسٹیج کے باہر بھی گلفام ہی نظر پڑے۔ ہماری کہانی کے ہیرو مدے خاں چھوٹی حیثیت کے صرف اتنا پڑھے تھے کہ اندر سبھا پڑھ کر یاد کرلیں۔ جاہل ہوں۔ کم حیثیت ہوں مگر حکومت کرنے کا کمال خدا کے یہاں سے لائے تھے۔ گاؤں میں اگر کہیں چوری ہو جاتی ہے اور پولیس تحقیقات کرنے آتی ہے یا کوئی حاکم دورے پر آتا ہے تو بعد کو لڑکے اِن واقعات کی نقل کیا کرتے ہیں۔ ایک لڑکا ہوتا ہے جو بلا اختلاف رائے تھانیدار تجویز کیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح ایک ہوتا ہے جو چور یا حاکم کا پلاٹ لیتا ہے۔ مدے خاں بھی اسی طرح کے تھے کہ اپنے ہم چشموں میں صرف ممتاز ہی نہیں تھے بلکہ ہر کام میں سب کی نظر انہی پر پڑتی تھی۔ اور لوگ بے ارادہ اِن کا حکم مان لیتے تھے۔ اندر سبھا کا خیال بھی سب سے پہلے انہی کو آیا تھا اور انہی نے دوسرے ایکٹروں کو بھی بھرتی کیا تھا۔ ہفتے میں ایک رات کو تماشہ ضروری ہوتا تھا۔ اور جب سہالک یعنی بیاہ شادی کا زمانہ ہوتا تھا یا جب کوئی نیا ایکٹر بھرتی کیا جاتا تھا تو ہفتے میں دو تین راتیں تماشہ کے لئے الگ کر دی جاتی تھیں۔

گاؤں بھر کی عورتیں۔ بچے اور نوجوان لوگ جمع ہو جاتے تھے جوان
عورتوں میں تو دن کو بھی اسی کا چرچا اکثر رہتا تھا۔ اس کے گانے گائے
جاتے تھے اور باتیں کرنے میں بھی اندر سبھا کا تلازمہ آجاتا تھا۔
ایک روز اندر سبھا والے جمع تھے۔ شاید کہیں باہر سے بلاوا آیا تھا
یا مشق کرنے کا ارادہ تھا۔ گاؤں میں ایک طرف آگ لگی دھواں اُٹھا
ہی تھا کہ گاؤں بھر جمع ہو گیا۔ رسی ڈول گھڑے۔ سیڑھیاں لمبی لمبی
لاٹھیاں جیسے یکبارگی زمین سے نکل پڑیں۔ شور کرنے والوں نے
آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لوگ ایک طرف بجھاتے تھے کہ آگ دوسری طرف زبان
درازیاں کرنے لگتی تھی۔ اتنے میں ایک کھلی ہوئی چھت پر ایک عورت
کی چیخ کی آواز آئی۔ گھر کے اندر تو آگ لگی ہی ہوئی تھی وہ غریب
اترتی کدھر سے۔ کونے میں دوسری طرف چھپر تھا۔ وہاں آگ اس وقت
تک نہیں پہونچی تھی۔ مگر وہ چھپر گرایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لوگ چھپر کو
تو صبر کر سکتے ہیں لیکن آدمی کی جان بڑی چیز ہے۔ اے لیجئے اُدھر بھی
آگ نے لے لیا۔ سیڑھی لگائی گئی اور ایک آدمی چھت پر چڑھ ہی
گیا۔ مگر اُترے کدھر سے۔ جدھر سے وہ چڑھا تھا دیواروں پر چاروں
طرف پر چھپتیاں تھیں۔ اُدھر بھی آگ پہونچ گئی تھی۔ مگر وہ شخص جان پر
کھیل گیا۔ اور اُس عورت کو گود میں لے کر مکان کے پچھواڑے کود گیا۔

کسی کا گھٹنا ٹوٹا کسی کی ٹھڈی سے خون بہہ نکلا۔ مگر جانیں دونوں کی بچ گئیں۔ دیکھا گیا تو میاں گلفام تھے اور وہ جو اُن کی اصلی زندگی میں آئندہ چل کر سبز پری ہوئیں۔

جہاں جان کی جوکھم آن پڑتی ہے وہاں تصنع بنوٹ کا لفافہ دور جا پڑتا ہے اور آدمی کی اچھائی بُرائی سامنے آجاتی ہے پھر سکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ کون بھروسے والا آدمی ہے کون نہیں۔ عورت کی روح ایسا ہی آدمی پسند کرتی ہے یا کسی دوسری طرح کا۔ یہ کسی پڑھے لکھے آدمی سے پوچھئے یا اس قصے کی ہیروئین دھنا سے پوچھئے کہانی کہنے والے کو علم النفس نہیں آتا کھلتی ہوئی سانولی رنگت چھریرا بدن۔ آنکھوں میں وہ موہنی کہ آدمی کا کون ذکر پری کا دل موہ لیا۔ تماشہ دیکھنے والوں میں کون عورت ہوگی جو ایک خیالی پہلو سے اپنے آپ کو سبز پری کی جگہ نہ سمجھتی ہوگی۔ آخر آپ نے بھی ناول پڑھے ہیں۔ نہ معلوم کتنے بار اپنے آپ میں ہیرو۔ ہیروئن کی جھلک پائی ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ اثر گانے کا پڑا۔ ایک تو گلفام اور پھر تلوار باندھے بسنت رت جب آتی ہے تو چڑا چون چون کر کے چڑیا کو اپنے بس میں کر لیتا ہے۔ غریب دھنا تو پھر آدمی کا بچہ تھی۔ جو بات سمجھتی تھی گوشودر تھی۔ محبت نے خیال میں جو نفاست پیدا کر دی ہو وہ درکنار رہا آگ میں پھاند پڑنے والا معاملہ اس کو عورت کے نفسیات سمجھنے والے جانیں۔

ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ آگ کے واقعہ کے پہلے نہ معلوم دل میں کیا رہا ہو۔ لیکن اس کے بعد جوبن پیا بارسے تج دیں" میں نہ شک رہ گیا تھا نہ کلام۔ عورت کی ذات بودی کہلاتی ہے۔ مگر جہاں دل کا معاملہ آن پڑتا ہے وہاں اس کی بہادری کی قسم کھائی جاتی ہے یہی حال دھنا کا تھا۔ کہ نہ پنچ برادری کا ڈر رہ گیا تھا نہ مار دھاڑ کا۔ دھنا خیال کرتی تھی کہ زندگی کا مزا میٹھا۔ سلونا سیٹھا۔ کڑوا سب سے ملکر بنتا ہے اور وہی چوکھا ہوتا ہے۔ دُنیا اُس کو بے حیا سمجھے مگر عورت کی روح پکار پکار کر کہتی ہے ؎

دل و دیں را بہ رہ دوست نثارے کردم
حاصل عشق ہمی بود کہ کارے کردم

دھنا کی شادی ہوچکی تھی۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ دھنا کے ماں باپ بھی یہی چاہتے تھے کہ جلد رخصت کر دیں مگر پنڈتوں کا حساب اور سن کا پھیر ایسا تھا کہ ساعت نہیں بن رہی تھی۔ اسی انتظار میں سال بھر گذر گیا ماں باپ نے کوئی جتن اُٹھا نہیں رکھا۔ نہ معلوم کتنا مارا پٹیا۔ مگر سو ب بجائے چاہے اُونٹ بھاگ جائے لیکن سختی سے دِل کی لگی، لگی ہی رہتی ہے ؎

اینہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

خدا خدا کر کے رخصتی کا وقت آیا۔ دھنا رو دھو کر سسرال چلیں۔

دھنا کی سسرال دور تھی۔ درمیان میں بڑا گھنا جنگل پڑتا تھا جس وقت
یہاں یہ لوگ پہونچے میاں مدے خاں نے دھاوا بول دیا۔ اور دھنا کو چھین
لائے۔ نوابی جا چکی تھی مگر عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ اس طرح کے واقعات
اکثر ہو جاتے تھے۔ واردات کی کچھ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈاکے کا مقدمہ تو چلا نہیں۔
لیکن بیاہی عورت کو بھگا لیجانے میں میاں مدے خاں چھ مہینے کے لیئے
جیل بھیجدیئے گئے۔ اس دوران میں دھنا کا پوچھنے والا کوئی نہیں رہ گیا
تھا۔ غریب نہ میکے کی رہی نہ سسرے کی۔ سسرال والوں کا کیا ذکر خود ماں
باپ تک غریب کی طرف پھر کے نہ دیکھ سکے۔ مدے خاں کی ماں نے البتہ
چھاتی پیٹ سے لگایا۔ اور بہو بنا کر رکھا۔ ان کا نام دھنا سے بدلکر فوجدارن
ہو گیا۔ چھ مہینے کے بعد پھر وہی گلفام اور وہی سبز پری۔ پہلے یہ مشغلہ
شروع ہوا تھا دل بہلاؤ کو اور اب روٹیوں کا سہارا اٹھہرا۔ مدے خاں
جب تک جئے ان کی اندر سبھا دوسروں کے مقابلہ میں ایسی رہی جیسے
دیوتاؤں کی محفل میں اندر۔ گلفام کا پارٹ تو کچھ دنوں کے بعد چھوٹ
گیا مگر کالا دیو بہت دنوں تک بنتے رہے۔ پھر یہ بھی گیا۔ اور خالی تجربے
کی بنا پر کمپنی کے مالک منیجر کی طرح کام کرتے رہے اور اُستاد کہلانے لگے
بی فوجدارن کی عزت مدے خاں کے ساتھ بڑھتی گئی اور جتنے ایکٹر تھے
ان کو اُستانی کہتے تھے۔ اتنے میں مدے خاں کا انتقال ہو گیا۔ فوجدارن نے

مدّے خاں کے شاگردوں کے ذریعہ سے اندر سبھا جاری رکھنی چاہی مگر نہ کر سکیں۔ ناچار ماما گیری کرنے لگیں۔ رنڈاپے سے زیادہ بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ اندر سبھا کا وقت گیا تھیٹروں کا زمانہ آیا۔ تھیٹروں کا زور کم ہوا سینما کا دور دورہ ہوا۔ بی فوجدارن بہت بوڑھی ہو گئیں۔ مگر دو باتیں نہ چھوڑیں۔ ایک تو جمعرات کے دن مدّے خاں کی قبر پر جانا دوسرے اندر سبھا کا ذکر اس طرح کرنا جیسے ابھی کی بات ہے۔ غریب آدمی نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ اس لئے جو کچھ کماتی تھیں اس میں سے کچھ جز و تکلیف اُٹھا کے اپنے گور گڑھے کے لئے ضرور رکھتی جاتی تھیں۔ کہ محتاجی میں نہ اُٹھائی جائیں۔ ساتھ والیاں ان کی جز رسی پر آوازے کستی تھیں کہ نہ معلوم کس کے لئے جمع کر رہی ہیں۔ مگر یہ سنی ان سنی کر جاتی تھیں۔ اور جواب نہیں دیتی تھیں ان کے اثاثے میں ایک بالس کی پٹاری بھی تھی۔ جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اس کو فوجدارن جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ ان کے جیتے جی کسی کو نہ معلوم ہوا کہ اس کے اندر کیا ہے۔ گو لوگ اندازہ کرتے تھے کہ عمر بھر کی کمائی اسی کے اندر ہو گی۔ جب ان کا آخر وقت ہوا اور زبان بدل گئی۔ آنکھوں پر پردے پڑ گئے تب یہ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر کسی کی سمجھ میں آتا تھا۔ سکرات میں فوجدارن کو گھنٹوں لگ گئے اور یہ اسی طرح پائی

پانی کہتی تھیں۔ پہلے لوگ سمجھے پانی مانگتی ہیں۔ کسی نے کہا ارے پٹاری تو نہیں کہتی ہیں۔ لوگوں نے پٹاری کھول کر دیکھا تو ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی چھ اشرفیاں نکلیں۔ اور ٹوٹا پھوٹا۔ کلا تبوں سیاہ۔ ستارے مانند۔ گلفام کا تاج ایک عورت نے لاکر ان چیزوں کو اُن کے سینے پر رکھدیا۔ اِدھر رکھنا تھا کہ اُدھر معلوم ہوا کہ کلی چٹکی اور بو نکل گئی۔

روزہ خور کی سزا

لوگ کہتے ہیں کہ ہر بڑی چیز کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ اصلیت کو ظاہر کر دیتی ہے۔ دولت کے لئے شاعر کہتا ہے ؎

بادہ نوشیدن وہشیار نشستن سہل است
گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی

شراب کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ آدمی کی شرافت اور کمینہ پن کو آئینہ کر دیتی ہے۔ حج اور دوسری بڑی عبادتوں کے لئے کچھ ایسی ہی باتیں مشہور ہیں۔ اکثر جاہلوں کو کہتے سنا ہے کہ ایمان حجر اسود میں چمٹ کر وہیں رہ گیا۔ اسی قبیل کی ایک کہانی مجھ کو بھی یاد آ گئی سن لیجئے مگر اس کے پہلے عرض یہ ہے کہ دو مین معترضہ جملے بھی ہیں۔ کنایہ میں جو لطف ہے وہ تصریح میں کہاں۔ مگر ڈر لگتا ہے کہ اگر بیان کرتے نہ بنا تو قصہ گپ چپ کا لڈو ہو کر رہ جائے گا برنارڈ شا اسی وجہ سے پچاس صفحے کے ڈرامے کے پہلے دو سو صفحے کا دیباچہ لکھتے ہیں۔ چھوٹے سارے بالے میاں بڑی ساری پونچھ۔ حضرات ہم کوئی دعویٰ اس قسم کا نہیں کر سکتے۔ ایک چھوٹی سی تمہید لکھنے کے بعد اطمینان سا ہو جاتا ہے کہ اب باوجود ہماری کج بیانی کے لوگ بات کی تہ تک پہونچ ہی جائیں گے۔

شیخ جی سے نہ مجھ سے ہم مذاقی تھی نہ ہمسنی مگر میرے اُن کے مراسم تھے اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ میں ایک دوست کے یہاں بیٹھا ہوا کچھ قلمی کتابوں کا ذکر کر رہا تھا۔ کہ شیخ جی آ گئے اور ہم لوگوں کی باتیں سُنکر کہنے لگے۔ میرے پاس کچھ قلمی تصویریں ہیں مجھ کو تعجب ہوا کہ شیخ جی ٹڈیوں کا روزگار کرتے ہیں۔ ایسے پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں ان کے یہاں قلمی کتابیں کہاں سے آئیں مگر انھوں نے کہا کہ اگر ابھی چلئے تو میں دکھا دوں۔ میں اُٹھا چلا گیا اُنھوں نے پانچ چھ کتابیں دکھلائیں۔ ایک عملیات کی کتاب۔ ایک زہر عشق۔ ایک رقعات عالم گیری۔ جو پچیس تیس برس اُدھر کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے چند پرانے اوراق قصے کے۔ خط معمولی تھا اور کاغذ بھی ایسا ہی ویسا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اپنے لئے زہر عشق تو اس وجہ سے نقل کی ہوگی کہ اُس کا چھپنا ممنوع تھا۔ اور رقعات عالمگیری وغیرہ پیسے بچانے کو یا مشق کرنے کو نقل کی ہوگی البتہ دو اور کتابیں تھیں۔ ایک منطق الطیر اور ایک کلیات سعدی یہ دونوں ولایت کے خط کی تھیں۔ اور بعد کو کوئی سو برس کی مستند ثابت ہوئیں۔ یہ دونوں نسخے دیکھکر میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے کہا شیخ جی یہ آپ نے کہاں سے پائے۔ معلوم ہوا کوئی عزیز اُن کے کہیں مولوی گیری پر نوکر تھے۔ اور آخر عمر میں شیخ جی ہی کے یہاں آ کر رہے تھے اور یہیں انتقال بھی ہوا۔ اِن کے مختصر اثاثے میں یہ کتابیں بھی نکلی

تھیں میں نے چاہا کہ شیخ جی مجھ سے اُن دونوں کتابوں کے دام لے لیں۔
مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کمیاب اور قیمتی
کتابیں ہیں اور بھلے چنگے دام ملیں گے۔ مگر شیخ جی نے باوجود کاروباری
آدمی ہونے کے اس کو کسی طرح منظور نہیں کیا اس کی دو وجہیں تھیں
ایک تو یہ کہ شیخ جی دوسرے مذاق کے آدمی تھے جس میں کتابوں کا نہ
ذکر تھا نہ قدر۔ دوسرے اُن کی ایک غرض مجھ سے اٹکی تھی۔ اور اسی
وجہ سے میں چاہتا تھا کہ وہ دام لے لیں مگر اُنھوں نے نہ مانا اور کہنے
لگے کہ اگر میں نے ان کتابوں کو نہ لیا تو اُن کو شکایت ہو گی۔ گو میں
اُن کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا مگر اُن نسخوں کو دیکھ کر مُنھ میں پانی بھر آیا
اور میری خودغرضی نے غریب دور اندیشی کو چُپ ہی کر دیا۔ اسکے بعد
شیخ صاحب ہمارے یہاں زیادہ آنے لگے۔ رفتہ رفتہ مراسم گھرے
ہو گئے۔ ہمارے بے تکلف ہم مذاق احباب میں ایک صاحب کچھ خدائی
فوجدار قسم کے تھے جن کو یہ بے جوڑ دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اور شیخ
جی اور اِن کا سامنا اگر ہو جاتا تھا تو منٹ دو منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی بہانا
کر کے وہ اُٹھ جاتے تھے اکثر مجھ سے کہا بھی کہ شیخ جی اور تمھاری دوستی کے
دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو تم ہڈی کا روزگار کرنا چاہتے ہو یا شیخ جی عنقریب
شعر کہنا شروع کر دیں گے شیخ جی سے مراسم کی بنا پر اُن کے ایک قرضدار میرے پاس

آئے اور کہنے لگے کہ ایک جزو جائداد میری شیخ جی کے پاس رہن باقبضہ ہے جس کو شرائط دستاویز کی بنا پر میں آٹھ نو برس نہیں چھڑا سکتا۔ اگر آپ اپنے دوست سے سفارش کر دیں تو میرا کام بن جائے۔

میں۔ حضرت۔ معاملات میں مجھ کو نہ ڈالیئے میرے اور شیخ جی کے نازک مراسم اس بار کو شائد نہ برداشت کر سکیں۔ اور شائد روپیہ بھی آپ سے فراہم نہ ہو سکے۔

وہ صاحب۔ روپیہ میں کہاں پاتا۔ مگر اس وقت ایک شخص اس جائداد کو بیع لینے پر تیار ہو گیا ہے۔ اگر یہ معاملہ ہو جائے تو شیخ جی کا قرضہ نکالنے کے بعد مجھ کو سو دو سو روپیہ بچ جائیں گے۔

اِن صاحب کی مفلوک الحالی اور شریف تباہی پر مجھ کو تاسف آیا اور میں نے کہنے کا وعدہ کر لیا مگر اِس سے زیادہ اُمید نہیں دلائی۔

دوسرے دِن شیخ جی سے ملاقات ہوئی۔

میں۔ شیخ جی آپ کے فلاں عزیز اور راہن کہتے تھے کہ اگر آپ اُن کو مرہونہ جائداد بیع کرنے کی اجازت دیدیں تو آپ کا قرضہ ادا کرنے کے بعد اُن کو سو دو سو روپیہ بچ جائیں گے۔

شیخ جی۔ اس جائداد میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ میں نے جو روپیہ اُن کو دیا ہے وہی اُسکے دام سے زیادہ ہے اُس کو کون مول لیگا۔

میں۔ میں نے صرف اسوجہ سے عرض کردیا کہ میں نے راہن صاحب سے
وعدہ کیا تھا ورنہ میں نہ آپکے نقصان کا ساتھی ہوں نہ راہن صاحب سے
مجھ سے اسقدر مراسم ہیں۔ کہ آپ ایسے عنایت فرماؤں پر زور ڈالنے کی
جراءت کروں۔
شیخ صاحب۔ جی نہیں۔ آپ کا فرمانا ایسا نہیں ہے کہ میں خیال نہ کروں
آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ اگر میرا روپیہ وصول ہو جائے تو مجھ کو کوئی عذر نہیں
میں۔ دیکھیے شیخ صاحب میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھ کو کسی سے واسطہ ہے
تو آپ سے۔ اِن صاحب سے تو صرف شناسائی ہے۔ آپ میرے خیال
سے ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ میں آپ کے نقصان کا ساتھی کیسے ہو سکتا ہوں
اس معاملہ میں میری حیثیت ایک پیغام پہونچانے والے سے زیادہ
نہیں ہے۔
شیخ جی۔ جی نہیں اُنھوں نے کُچھ تو سمجھ کر آپ سے کہلایا ہے۔ آپ اُن سے
کہدیجئے کہ میں جائداد چھوڑنے کے لئیے ہر وقت تیار ہوں۔ یہ خوشخبری
میں نے راہن صاحب کو دیدی۔

رمضان شریف کا مہینہ بجوڑ کا وقت تھا کہ راہن صاحب نازل
ہوگئے شیخ صاحب کو آدمی گیا کہ ذرا تکلیف کیجئے وہ بھی تشریف لائے
میرے پڑھنے والے۔ اس میٹھی پھیکی کہانی پر مجھ سے خفا نہ ہو جیئے آپ

کی خدمت میں حاضر ہونے کو دِل بے تاب تھا۔ ؎

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

اگر کوئی رنگین کہانی دماغ میں نہ تھی تو کیا کرتا۔ ؎ گندم اگر بہم نہ رسد بھُس غنیمت است"۔

شیخ جی یعنی مرتہن صاحب اور خریدار صاحب دونوں روزے سے تھے اور ایک دوسرے کو یوں دیکھتے تھے جیسے اپنے مقابل ہی سے روزہ افطار کرنے کا ارادہ ہے۔ خالی موقعے اور وقت کا انتظار ہے۔ شیخ جی کے انداز پر میرا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا کہ یہ اتنے سہل میں راضی ہو گئے ہیں اس کے معنی کیا ہیں۔ بیچارے نے پیسہ پیسہ جوڑ کر اپنی حیثیت بنائی ہے اگر یہ اسی طرح کی دریا دلی سے کام لیا کرتے تو آج یہ اطمینان کہاں سے نصیب ہوتا ہو نہ ہو یہ مجھ کو زیر بارِ احسان کیا چاہتے ہیں۔ اور پھر خیال آتا تھا کہ تم کون اتنے بڑے آدمی ہو کہ جس کے ذریعہ سے اُن کا ہزار یا پانچسو کا فائدہ ہونے والا ہے۔ وہ بدہ گفتگو میں سچائی کی ایک کھنک ہوتی ہے جیسے کھرے روپیہ میں۔ ان کی گفتگو دل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ راہن صاحب کی پریشان حالی بھی ایک طرف دل میں جگہ کر چکی تھی۔ اس وجہ سے قوت متصرفہ بھی کچھ کمزور سی پڑ گئی تھی۔ اسی پس وپیش میں تھا کہ مرتہن صاحب

بھی آگئے اور اُن کو یہ خوشخبری دینا ہی پڑی۔
مرتہن صاحب۔ آپ ہی خریدیں گے۔
راہن صاحب۔ جی ہاں۔
مرتہن صاحب۔ آپ کیا کھا کے خریں گے۔
خریدار صاحب۔ ارے ہم تو یہ خرید لیں اور آپ کو بھی خرید لیں۔
مرتہن صاحب۔ آپ ضرور خریدیں گے ایسے جھپ جھائیے بہت دیکھے ہیں
خریدار صاحب۔ جھپ جھائیے ہو گے تم اور تمھارے باپ۔ ہڈیاں
بیچ بیچ کر چار پیسے جمع کر لئے ہیں اس پر آئے ہیں ہم سے باتیں کرنے۔
مرتہن صاحب۔ اور تم نے سوائے تھانیداروں کی دلالی کرنے کے
عمر بھر کیا کیا ہے۔ کچھ پونجی ہو گئی بس اپنے آپے سے باہر ہو گئے۔
میں۔ ہاں ہاں صاحب آپ لوگ لڑتے کیوں ہیں شریفوں کی طرح
باتیں کیجئے۔ آپ معاملہ طے کرنے آئے ہیں یا گالی گلوج کرنے۔
خریدار صاحب۔ میں نے تو کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ یہ تو انھوں ہی
نے آتے ہی اس قسم کی باتیں شروع کیں۔
راہن صاحب۔ اچھا اب آپ ہی طرح دیجائیے ہو گا۔
خریدار صاحب۔ طرح کیا دیجائے۔ کہیں دو چار سو روپیہ پانچ چھ
روپیہ سیکڑا بیر لگائے ہوں گے اس پہ آئے ہیں مقابلہ کرنے۔

شیخ جی۔ (گرج کر) بارہ روپیہ سیکڑہ سے کم پر تو ہم بات نہیں کرتے ہیں۔
خریدار صاحب۔ چلو ہمارے ساتھ ہم چوبیس روپیہ سیکڑہ تک کی دستاویزیں دکھلادیں۔ اور کمیشن اوپر سے۔ تم کو نصیب ہوا ہوگا یہ نرخ لینا۔
میں۔ اِن فضول باتوں سے کون مطلب۔ اگر آپ کو لڑنا ہی ہے تو باہر جاکر لڑیئے۔

ناظرین اِن حضرات کی طرف سے میری معذرت قبول کیجئے۔ خدا کے یہ نیک روزہ دار بندے نہ خاندانی مہاجن تھے۔ نہ باپ دادا کے وقت سے سودخواری کے مشاق تھے۔

اسی وجہ سے معاملہ فہمی میں کچھ کسر باقی رہ گئی تھی مگر قرینے سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک پشت کے بعد۔ باوجود رمضان شریف کے بردباری اور سودخواری دونوں میں مضبوط ہو جائیں گے۔ ان حضرات کے منہ سے جھاگ اُڑ رہی تھی۔ لہریں نہیں بلکہ جوار بھاٹے آرہے تھے۔ ہونٹوں کے کنارو نپر سمندر پھین جمتا جاتا تھا۔ اور ان دو نیک لوگوں میں ہم روزہ خور گنہگار پھنس گئے تھے اُنکے مُنہ سے خوشبوئں کے بُھقے بھق بھق اڑ رہے تھے۔ اور ہم محسوس کر رہے تھے کہ روزہ نہ رکھنے کے...... گرفتار ہیں۔ اسی تو تو میں کے درمیان میں ہمارے خدائی نوجدار قسم والے دوست بھی آگئے۔ تھوڑی دیر چپ چاپ رہے اس کے بعد میری پریشانی دیکھ کر کہنے لگے۔ شیخ جی سی دوستی بھی کروگے اور روزہ بھی نہ رکھوگے۔ اور روزہ دار کے منہ کی بو سے بھی گھبراؤگے۔ آخر تمھارا حشر کیا ہونے والا ہے"۔

دھوکا

ناجو غریب کا بچہ تھی مگر پیدائش اچھی ہونے کی وجہ سے اپنی ساتھ والیوں سے بڑی معلوم ہوتی تھی کیا کھایا کیا پیا مگر ہاتھ پاؤں ایسے تھے کہ دیکھنے والے جانے کہ دودھ ملیدے ہی پر پلی ہے۔ صورت پر بھی وہ شان تھی کہ شاہزادیاں شرما جائیں معلوم ہوتا تھا کہ جوانی پر کر اگر تاج پہن لے گی تو بے جوڑ نہ لگے گا۔

کھیت میں لگکڑی اور گھر میں لڑکی کی باڑھ مشہور ہے۔ دیکھتے دیکھتے بڑی سی ہو گئی۔ سات ہی آٹھ برس کے سن میں یہ حال تھا کہ ماں کے پہلو میں بیٹھتی تھی تو آدھی بی بی معلوم ہوتی تھی۔ باپ ناظمہ کہتے تھے ماں جب تک جئیں ناجو ہی پکارا کیں۔ گیارھواں برس رہا ہو گا کہ باڑھ پر آگئی۔ بارھویں برس بھرنا شروع ہوئی۔ تیرھویں برس ایسی ہو گئی کہ ماں باپ سے نگاہ بھر کے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ماں کو بیاہ کی فکر پڑ گئی۔ اس زمانے میں بر بڑی بڑی امیرزادیوں کو نہیں جڑتا غریب کس کھیت کی مولی ہے، یہ جوانی یہ خوبصورتی دیکھ کر ماں باپ کی چھاتی پہاڑ ہو جاتی مگر یہاں نگاہ بھر کے دیکھنا مشکل تھا۔ باپ صرف اچٹتی نظر ڈالتے تھے ماں کہتی تھی دیکھتے ہو۔ اب کیا کسر ہے کچھ نسبت کی بھی فکر کرو گے کہ یہ کالا پہاڑ یوں چھاتی پر رکھا رہے گا۔

دیوانی عدالت کے منصرم صاحب کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا ہمدردوں نے جوڑ توڑ ملا کر شادی کروا ہی دی۔

منصرم صاحب کا سن چالیس کے لگ بھگ رہا ہو گا۔ چالیس بیالیس برس کا مرد بڈھا نہیں کہا جاتا انکی کاٹھی بھی اچھی تھی مگر پندرہ اور بیالیس میں اچھا خاصہ فرق ہوتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ ناجو نے ہمجولیوں میں بھی بیٹھ کر کبھی اپنے سن کی ایسی باتیں نہیں کیں۔ ہمیشہ بھاری بر کم اپنے کو لیئے دیئے رہیں۔ سولہ برس کے سن میں بھی مزاج اور حوصلہ ۱۶ برس والی کا ایسا رہا۔

ایک بڑے بدصورت ادھیڑ میاں اور ایک خوبصورت کمسن بی بی راستے میں چلے جاتے تھے۔ بی بی نے ایک کتے کی جوڑی دیکھی، جو دونوں ایک ہی طرح کے تھے۔ میاں سے کہنے لگیں ایسا جوڑ ملتے بھی کم دیکھا ہو گا۔ انھوں نے جواب دیا ساتھ رہتے رہتے پہلے خیالات اور پھر صورت ملنے جلنے لگتی ہے۔ بی بی کا جی دھک سے ہو گیا کہنے لگیں میری جان کیا ہمیشہ یہی ہوتا ہے؟

منصرم صاحب شریف خصلت نیکنام آدمی مشہور رہتے گھر کے بھی خوشحال کہے جاتے تھے شاید تیسری شادی نہ کرتے مگر اولاد کی تمنا اور بیماری حیرانی میں ہمدردگی ضرورت نے مجبور کر دیا۔ لڑکی والوں کی فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی مصلحت نے اس سن کے فرق کا زیادہ خیال کرنے بھی نہ دیا۔ حالانکہ ناجو کی ماں ہی نے نسبت پسند کی تھی مگر اسی کے ساتھ تنہائی میں میلا

ے دبی زبان بہن کے فرق کا بھی ذکر کیا تو اُنھوں نے یہ کہہ کر بات ٹالدی کہ
سب کچھ تو کسی کو نہیں ملتا۔ ناجو پھندناسی دلہن بنیں دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ
ٹھنڈا ہوا۔ دو سو تولے کا گہنا پہن کر سونے میں گندھ گئیں۔ چاہنے والا
میاں پایا۔ ہر طرح کا چین آرام ہاتھ آیا۔ منصرم صاحب بھی خوشی میں
خضاب جلدی جلدی لگانے لگے۔ ناجو نے جانا دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے
میاں بی بی کے رازِ پردے کی بات کسی کو کیا معلوم۔ مگر خدا کو دیکھا نہیں عقل
سے پہچانا ہے۔ سِن کے تقاضے سے شوخی اچپلاہٹ کا جواب شائستگی سے ملتا
رہا ہوگا تو یقیناً ناجو اس کو بھی زندگی کے کھیل کے ضروری قاعدوں میں
سمجھتی رہی ہونگی۔ پیٹ کا ملا کر ناجو کی شادی پندرھویں سال ہوئی تھی زن جواں
مرد پیر سبد۔ بیار و بچہ بگیر۔ ڈیڑھ برس میں ماں بھی بن گئیں مگر کیا بچہ ہوا
جیسے چوہیا کا بچہ پیدا ہونے کے بعد بڑی دیر تک تو رویا نہیں۔ لیڈی
ڈاکٹر نے بڑی بڑی ترکیبیں کیں تب کہیں چیں چیں آواز نکلی اور پھر ہمیشہ
کے لئے بند ہوگئی ناجو البتہ بہت دن بیمار رہیں۔ اسکے بعد ہمیشہ کے لئے
قابلہ کی روزی کا سامان ہوگیا۔ مگر ناجو کے پھر بچہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ناجو تیس اکتیس
سال کی تھیں کہ رانڈ ہوگئیں منصرم صاحب پنشن لیکر اپنے وطن چلے گئے تھے
تقریباً دو ہی برس آرام کیا تھا کہ دوامی آرامگاہ میں پہنچ گئے ناظمی
بیگم کے ماں باپ پہلے ہی مرچکے تھے اب منصرم صاحب بھی ختم ہوگئے ناظمی بیگم

تنِ تنہا رہ گئیں۔ جائداد رکھ کر یکسوئی سے زندگی بسر کرنا کسی کے امکان میں نہیں۔ جہ جائے پردہ دار ر انڈ۔ منصرم صاحب ناظمہ بیگم کے لئے ہر طرح کی مضبوطی کر گئے تھے مگر پھر بھی بغیر ایک ہمدرد کے کیسے کام چلتا۔ منصرم صاحب کے اعزا کو مرحوم کی جائداد سے کچھ ملا نہیں تو انھوں نے کوئی واسطہ بھی نہیں رکھا۔ محلہ میں ایک لڑکا رہتا تھا بیس اکیس برس کا سن رہا ہوگا مگر نہایت شریف لائق اور سلیقہ مند محلہ کے رشتے سے منصرم صاحب مرحوم کو چچا کہتا تھا اور جب سے وہ پنشن لے کر آئے تھے یہ پیش پیش رہتا تھا۔ میں اصلی نام تو اس کا بتا نہیں سکتا قصے کی ضرورت سے صغیر احمد کہہ لیجئے۔

یہی میاں صغیر آڑے وقت میں کام آئے اور خدا ترسی سے سب کام کر دیا کرتے تھے۔ دن بھر میں اگر چار مرتبہ ضرورت ہو تو یہ اپنے کام کا ہرج کر کے حاضر رہتے۔ جھونٹوں بلا بھیجو تو غریب ڈیوڑھی میں پردے کے پاس موجود۔ اِن کو اپنا ذاتی کام زیادہ تھا بھی نہیں۔ اکیلے تھے۔ ماں باپ نے بود گی اچھی خاصی چھوڑی تھی دو چار مکانات بھی تھے اس میں سفید پوشی سے کاٹتے تھے شادی تو ہو چکی تھی مگر بی بی سے بنی نہیں چوتھی چالے کے بعد سے پھر ایک نے دوسرے کی صورت نہیں دیکھی تھی تین برس ہونے کو آتے تھے مگر ملاپ کی کوئی صورت نہ تھی بگاڑ مزمن عارضے کی طرح جڑ پکڑ گیا تھا۔ جب صغیر ناظمہ بیگم کے اتنے کام آتے تھے تو یہ کہاں گی گئی گذری تھیں کہ اُن کا

حال پوچھ کر اظہار ہمدردی نہ کرتیں۔

مقدمات معاملات کی باتیں پردے کے پاس آہستہ آہستہ ہوتی تھیں اسلئے بعد کو ہمدردی یگانگی کی باتیں بھی اسی مدھم آواز میں ہوا کرتی تھیں باتیں کون تھیں صرف یہی کہ "کیا کیا کرتے رہتے ہو" اپنی بی بی سے ملاپ کیوں نہیں کر لیتے۔ گھر آباد ہو جائے پڑوس میں ایک ہمدرد بڑھ جائے۔ صغیر اس کے جواب میں صرف یہی کہتے تھے۔ کہ اب ملاپ قیامت میں ہو گا اور پان لے کر چلے جاتے تھے۔

صغیر کے چلے جانے کے بعد ناظمہ بیگم کے دل کے اندر کوئی ان سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

سنئے صاحب میں کہانی لکھتا نہیں ہوں کہانی کہتا ہوں اگر آپ کو اس میں دُو بدُو باتیں کرنے کا مزا نہیں آتا تو اس بکواس کو در رد فان کیجئے اگر اچھی معلوم ہوتی ہو تو سنتے چلئے کہ فاطمہ بیگم صاحبہ کی سلیم عقل نے کیا کہا۔ ان کی دبی ہوئی خواہش نے کیا کہا اور ان کے حس باطن نے عقل و خواہش سے کیا کچھ کہلایا۔

اندر والا۔ سنو بی ناجو تم اور صغیر پردے سے لگے گھڑیوں باتیں کیا کرتے ہو اور جو کوئی کچھ کہدے۔

ناجو۔ مجال ہے جو کوئی کچھ کہدے۔ کر نہیں تو ڈر کسی کا۔ بھلا مجھ سے آٹھ برس

بھوٹا اور پھر وہ تو مجھکو بھی کہتا ہے۔

اندر والا۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کیا کرتی ہو۔

ناجو۔ تو اس میں کیا حرج ہے اگر میرے خیالات دوسرے ہوتے تو اس کی بی بی نگوڑی کا ذکر کیوں آتا۔

اندر والا۔ تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجو۔ ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے۔

اندر والا۔ پہلے کیوں نہیں ہنستی تھیں۔ ہنسی تو ہنسی پرانی مثل ہے۔

ناجو۔ ہوا کرے مثل۔ میرے بڈھے پر سے ہزار جوان صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا۔ جب جوانی میں اس طرح کے خیالات نہیں آئے تو اب بڑھاپے میں اس کا کیا ذکر۔

اندر والا۔ بوڑھی تو تم بالکل نہیں ہو اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

ناجو۔ میرے تو ایک لڑکا بھی ہوا ہے اس کی بیوی تو ویسی ہی ٹیھیا بنی ہے۔

اندر والا۔ مگر وہ صورت میں تو تمھارے تلوؤں کے برابر نہیں ہے۔

ناجو۔ یہ ٹھیک ہے مگر اس سے ملاپ تھوڑی ہونے کو ہے۔

اندر والا۔ اور جو ہو جائے۔

ناجو۔ ہو جائے تو ہماری جوتی سے لتڑے سے یا پوتش سے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندر والا۔ یہ دیکھو کھلانا۔ یہی تو میں کہتا تھا۔

ناجو۔ ہوگا بھئی ہم کیا کریں۔ نیند نہیں آتی تو یہی سوچنے لگتے ہیں کوئی نہ کوئی
خیال آئے گا تو ضرور۔

اندر والا۔ اور اسی کو سوچتے سوچتے سو بھی جاتی ہو۔

ناجو۔ ہاں سو جاتے ہیں سو جاتے ہیں تب نہیں تو اب سو جاتے ہیں۔ منصرم صاحب
تو ہیں نہیں ہمیں ڈر کس کا پڑا ہے۔ کر ہی لیں تو ہمارا کوئی کیا کرے گا۔

اندر والا۔ ہاں اب ٹھیک راستے پہ آگئیں یہی تو میں کہتا تھا کہ جو کچھ کرو ہم سے
صلاح مشورہ لے کر کرو۔ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر صغیر کے ساتھ ہو جائے
تو بیجا نہیں۔ گو اور سب باتوں کا آرام رہا مگر حسن کو جی ترس گیا۔

دنیا اور باتوں میں نکمی ہو یا ہوشیار ریاضی خوب جانتی ہے یعنی ایک
اور ایک جوڑ کر دو کا نتیجہ نکالنے میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔ دو ہی چار دنوں میں
بانڈھنوں باندھنے والی دنیا نے ہوئی اور ان ہوئی ——— باتوں کو
اکٹھا کر کے اچھا خاصہ پلاٹ تیار کر لیا جس کی ہیروئین ناظمہ بیگم اور ہیرو میاں
صغیر ٹھہرے۔ رشدہ رشدہ یہ بات ناظمہ کے بھی کان تک پہونچی۔ بیچاری بہت
پریشان ہوئی۔ کر تو کر نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر۔ تمام زندگی ایک سرے سے
دوسرے سرے تک نگاہ کے آگے پھر گئی۔ وہ موتی کی آب جو آجتک ویسی کی
ویسی ہی تھی مدھم پڑتی دکھائی دی۔

آپ لوگ ناظمہ کے دلی راز سے ہزار واقف ہوں پھر بھی عورت کے

دل کی بات سمجھنے کا کون دعویٰ کر سکتا ہے۔

منصرم صاحب کو یاد کر کے آج ناظمہ ایسا روئی کہ شاید کبھی نہ روئی ہوگی۔ آج ضروری کام کا بھی ہرج ہو گیا مگر صغیر کو نہیں بلایا۔ دوسرے دن وہ خود آ گئے رفتہ رفتہ اندر والے نے صلاح بتائی! آبرو پر سے جان قربان ہے۔ تم ہزار پاک صاف رہو مگر دنیا بے دوکھ لگائے نہ چھوڑے گی۔ اگر اس کو ہرانے کی کوئی ترکیب ہے تو یہی کہ نکاح پڑھوا لو۔

ناظمہ اپنے منھ سے کیا کہتیں مگر اس کا انتظام کچھ مشکل نہیں تھا کہ چھیڑ ادھر ہی سے شروع ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دشمنوں کا منھ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اچھا ناظرین! اب ہٹئے یہاں سے۔ کھسکئے۔ غریب ہندوستانی عورت، شرم کے مارے کٹی جا رہی ہے۔ دوسرا نکاح بیچاری نے نہ معلوم کن اسباب کن مجبوریوں سے کیا۔ اور آپ ہیں کہ پردے کی باتوں کی ٹوہ لگانے کو اڑے ہیں۔ میں ہرگز نہ بتاؤں گا میرا گلا بھی کٹ جائیے تب بھی کوئی ایسی بات منھ سے نہ نکالوں گا کہ صبح کو آپ خیر صلاح کے بہانے آئیے اور مسکرا مسکرا کر اسکو دیکھئے اور بیچاری تا جو گردن جھکائے شرم کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو جائے خیر۔ اتنا بتائے دیتے ہیں کہ ناظمہ کی زندگی دوسری طرح کی ہو گئی۔ (آیا صغیر کے بھی خیالات بدلے اس کا حال آئندہ معلوم ہوگا) فی الحال اتنا سمجھ لیجئے کہ منصرم صاحب اور صغیر احمد کے ساتھ دو بالکل مختلف طرح کے ساتھ تھے جو

ایک دوسرے سے ویسے ہی الگ تھے جیسے ناظمہ کے بچپن کا زمانہ مختصر رنڈاپے کے زمانے سے۔ تب اگر ۱۶ برس کے سن میں اکسٹھ کی تھیں تو اب ۳۲ برس کے سن میں ۲۳ برس کی ہو گئیں تھیں۔ جو ہنسی جو گدگدی شروع میں نہ آئی تھی وہ بے فصل کے آم کی طرح سواد کھو کر آئی۔ یہ حسن باطن کا کھیل کون سمجھے۔

صغیر احمد نے ناظمہ کی جھلک یوں ہی کبھی دیکھ لی ہو گی اب بامراد دیکھا۔ وہ صورت شکل وہ رعب حسن وہ تناسب اعضا وہ مزاج کی شگفتگی اور یہ ٹھہرے بھو کے بنگالی آنکھوں میں چربی چھائی ہوئی ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے ایسے میں سن کا فرق کس کو دکھائی دیتا۔

البتہ دو چار برس کے بعد کچھ فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر۔ بڑی پیاری چیز تقدیر سے ہاتھ آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں وہ سختی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی بات میں بڑھاپا تو نہیں ہے۔

اندر والا۔ بڑھاپا تو نہیں ہے مگر وہ بنڈے کا کساؤ کہاں ہے۔

صغیر۔ اجی محبت اصل چیز ہے۔ بنڈا ونڈا کہاں رہتا ہے۔

اندر والا۔ محبت الگ چیز ہے۔ جوانی الگ ہے اِن دونوں کو ملاتے کیوں ہو۔

صغیر۔ جوانی کے دِن کی ہے۔ محبت تو ہمیشہ کی ہے۔

اندر والا۔ ہے تو ہمیشہ کی مگر جوانی میں بھی مقناطیس کا اثر ہے۔

صغیر۔ محبت کا لوہا مقناطیس کو نہیں مانتا۔
اندر والا۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے محبت جیسے پلاؤ اور جوانی جیسے میسنی روٹی ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے بیسنی بیسنی ہی ہے مگر روز روز پلاؤ کھا کر بھی کبھی بیسنی کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بیسنی والی سوندھاہٹ تو تمھاری بی بی ہی میں ہے۔

صغیر۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ اور جو باتیں جی چاہے کیا کرو مگر ہماری بی بی کا نام ہمارے سامنے نہ آوے۔

اندر والا۔ ارے میاں تمھاری بی بی سے ہم سے مطلب۔ ہم تو جوان عورت کا خواب دیکھتے ہیں وہ تمھاری بیوی ہو یا کوئی اور ہو۔ تمھاری بی بی کا نام تو اس وجہ سے آیا کہ وہاں تک پہونچ آسان ہے اور کوئی بات نہیں۔
صغیر۔ یار یہ تو ہے مگر ناظمہ غریب کی چھاتی پھٹ جائیگی اور مجھ کو بھی چین نہ نصیب ہو گا۔
اندر والا۔ خیر چھاتی واتی تو کیا پھٹے گی مگر ہے بڑی سخت بات، اور غضب تو یہ ہے کہ بغیر اس کے بھی پیاس بجھتی معلوم نہیں ہوتی۔
صغیر۔ یار تو پھر کیا کریں۔
اندر والا۔ کرو گے کیا باپ کرلو
صغیر۔ اور ناظمہ کو کیا کریں۔
اندر والا۔ کرو گے کیا۔ یہ یوں ہی رہیں گی وہ وہ رہی۔

اِن کا مقابلہ کوئی تھوڑی ہی کر سکتا ہے۔ اور وہ آئے گی تو تمھارے گھر میں رہے گی۔
یہ اس گھر میں رہیں گی اِن کا اُنکا سامنا بھی تو نہ ہو گا۔
صغیر۔ بھئی ناظمہ سے چار آنکھیں کیسے کریں گے۔
اندر والا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ سنو میاں ہم ہوں کہ تم ہو کہ ناظمہ ہوں سب اُوپر والے کے حکم کے
بندے "حسن باطن" کے۔ وہاں سے جو اشارہ ہو گا وہ کرنا ہی پڑے گا۔
آپ کون ایسے خوبصورت تھے کون بڑے روپے والے تھے کہ ناظمہ آپ پر ریجھ
جائیں حسن باطن نے کہا ناظمہ منصرم صاحب مرحوم کی صحبت میں تم اپنے ہم سن
کو ترس گئیں لہذا تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ صغیر کے ساتھ کر لو۔ ناظمہ نے کر لیا۔ اب تم
کو حکم دیا جاتا ہے کہ ناظمہ کو کبھی نہ چھوڑنا مگر اپنی کمسن بی بی سے ملاپ کر لو بندگی
بیچارگی۔ تمھارا بس ہی کیا ہے۔
صغیر۔ تو غریب ناظمہ دونوں طرف سے گئی منصرم صاحب کے وقت میں پلّہ ایک طرف
جھکا تھا اس بار دوسری طرف جھک گیا۔ دونوں کا نتیجہ اس غریب کے لیئے تو
بُرا ہی ہوا۔
اندر والا۔ یہ تو ہے ہی۔ ناظمہ کے ماں باپ نے شروع میں جو غلطی کی تھی اس کا
بھارجہ غریب ناظمہ کو بھرنا ہے۔ تم نے سُنا نہیں۔ خدا تین خطائیں معاف کرتا ہے
جدہ بھی کبھی کبھی ایک آدھ خطا معاف کر دیتا ہے مگر بھول چوک کی سزا فطرت
کے یہاں ہمیشہ بھرنی پڑی ہے۔

زندگی کا مقصد

سنہ ۱۹ کا قصہ ہے بظاہر کوئی سبق بھی نہیں حاصل ہوتا مگر واقعہ سچا ہے، جس کا ہونا نوجوانوں کی سمجھ میں مشکل سے آئے گا۔ البتہ مرزا صاحب مرحوم جنھوں نے وہ زمانہ دیکھا تھا اُن کو روزمرہ کی بات معلوم ہوتی تھی۔ اس قصہ کے ہیرو آغا صاحب کہلاتے تھے۔ انھی کے یہاں پشمینے کا کارخانہ تھا۔ اور نمکین چائے خوب بنتی تھی۔ اُن سے ایک دیہاتی رئیس صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ آغا صاحب نے اُن کی چائے کی دعوت کی۔ دیہاتی رئیس نے خواب میں بھی ایسی چائے کبھی کاہے کو پی ہوگی۔ جب کبھی لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوتا تھا تو آغا صاحب کے لیئے دیہات کے تحفے لے جاتے تھے۔ اور چائے کی فرمائش ہوتی تھی رفتہ رفتہ پینگیں بڑھ گئیں۔ اب یہ اصرار شروع ہوا کہ آغا صاحب ہمارے یہاں چلیئے تاکہ وہاں کے لوگ بھی یہ چائے پی لیں۔ مہینوں کا زمانہ وعدہ وعید میں ٹلا۔ پھر مہینوں تہیہ کرنے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد ایک دن آغا صاحب امام ضامن بندھوا کر چل کھڑے ہوئے۔ بڑی آؤ بھگت بڑی خاطریں ہوئیں۔ جن صاحب کے یہاں آغا صاحب مہمان گئے تھے اُن کے یہاں دن عید رات شبرات۔ مکان کا پھاٹک کبھی بند ہی نہ ہوتا تھا۔ ناچ رنگ اور اسی قبیل کے مشاغل زندگی کا مزا دوبالا کئے ہوئے تھے گئے تو تھے ایک ہی دن کے لیئے مگر کچھ ایسا لطف آیا کہ ایک دن اور بھی رہ گئے تیسرے

دن چلنے کا ارادہ کیا لوگوں نے توجہ دلائی کہ تیسرا دن مہمان کے جانے کا نہیں ہوتا
چوتھا دن اسی رعایت سے گذرا۔ پانچویں دن ارادہ مصمم ہوگیا کہ آج ضرور جائینگے
اتفاق سے اُسی دن سینما کی زبان میں ایک نئی آرٹسٹ کا مجرا تھا۔ کہا گیا کہ غضب
کیجئے گا بغیر ان کو سُنے چلے جایئے گا۔ اس کے بعد آغا صاحب نے کپڑے نہ ہونے
کا عذر کیا۔ خیر یہ کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہ تھا۔ اسی وقت درزی بیٹھ گئے میروانے
جوڑوں کی تیاری میں کتنی دیر لگتی ہے۔ ایک چھوڑ کئی جوڑے تیار ہوگئے۔ اس
عذر میں ایک کے بجائے دو دن گذر گئے۔ اب پھر روانگی کا پاتر اب ہوا مگر
دن کی نحوست کے خیال سے ارادہ فسخ ہوگیا۔ اسی طرح کبھی تاریخ نحس ہوئی
کبھی بھم کا جالا نہ ہوا آج قمر در عقرب ہے تو کل تحت الشعاع کبھی ریل چھوٹ
گئی۔ کبھی کوئی خاص دوست سے عین وقت پر رخصت نہ ہوسکے۔ غرضکہ روانگی
کی گھڑی یونہی ٹلتی رہی۔ حضرات ناظرین اگر روز روز کا حساب بتایا جائے
تو اس مشکل زمانہ میں کاغذ کہاں سے آئیگا۔ قصہ مختصر گیارہ برس اسی میں گذر گئے
اور آغا صاحب وہیں کے ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اتنا زمانہ صرف دور کی دلچسپیوں
میں کیسے صرف ہوتا۔ ہوتے ہوتے ایک نقلی بیڑی بھی پاؤں میں پڑ گئی اس کے
بعد دو ایک ہتھکڑیوں کا بھی اضافہ ہوگیا۔ اب جانے میں کچھ شرم مانع ہوئی
کچھ دل نے بھی نہ چاہا۔ بات ہمیشہ آئندہ پر اٹھتی رہی۔ وہی گیارہ برس کے
دوران میں والد ماجد کی علالت اور بعد کو انتقال کا بھی خط آیا مگر یہاں کی

خاک کچھ ایسی دامنگیر تھی کہ نہ جا سکے۔ انتقال کی خبر سُن کر بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر لوگوں نے سمجھایا کہ تمہارے لیئے جنازہ رکھا ہو گا اب اگر جانا ہی ہے تو کل جانا تاکہ سیوم میں شرکت ہو جائے مگر کچھ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ سیوم میں بھی نہ پہونچے۔ اسی طرح ماں بھی مریں۔ کارخانہ بھی تباہ ہوا اور مکان بھی گر گیا۔ زمین دوسرے شرکا نے لے لی۔ اب کیا تھا جس کے لیئے جاتے۔ دو برتن پاس ہوتے ہیں تو کسی نہ کسی طرح ٹھیس لگ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح گیارہ برس کے بعد رئیس صاحب سے کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ اور ہمارے آغا صاحب روٹھ گئے۔ لکھنؤ جا کر کس کو منہ دکھاتے اس لیئے کلکتہ کی سیدھ باندھی۔ جانے کو تو چلے گئے مگر دل نہیں لگتا۔ وہاں پر ہر شخص کاروباری اپنے دھندے میں لگا ہے۔ آپ کی زندگی ٹھہری بھونرا تتلی کے انداز کی کہ پھول پر بیٹھے رس چوسا اور اُڑ گئے۔ زندگی کا مقصد جوانی اور جوانی کا مقصد اپنے رنگین پروں کا مقابلہ پھولوں کی رنگینی سے رس جمع کرنے والے اور ہوں گے۔ یہ تو اُس برج دیس کے کنہیا تھے جہاں پھول کا مقصد پھل نہیں بلکہ صرف خوشبو تھا۔ جہاں بہار کا مقصد نامیہ نہیں بلکہ رنگوں کی نمائش تھا۔ حکیم ابیقورس کے نام لیوا آئندہ اور گذشتہ سے بے پروا حال پر جان قربان کرنے والے اس زمانہ میں آغا صاحب ہی تو تھے۔ اس وجہ سے وہی صحبتیں وہی احباب ہر وقت نگاہ کے سامنے پھرا کرتے تھے۔ کام کرنے کی عادت کبھی رہی تو کوئی مشغلہ اختیار

کر لیں ہمت ہر کام کی باندھتے ہیں مگر ہوتا کچھ نہیں سنہ بیڑی تو گیارہ برس میں
پڑی اور کٹ بھی گئی۔ مگر دو ہتھکڑیاں تین سو کوس پر بھی چین نہیں لینے دیتیں
ادھر رئیس صاحب بھی پریشان ہیں۔ مجبوراً ایک بے تکلف مصاحب روٹھے کو
منانے کلکتے بھیجے گئے۔ آغا صاحب پھر چلے آتے ہیں وہی دن ہیں وہی راتیں
زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔" اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھے ہیں۔ لیجئے
صاحب رئیس صاحب کا انتقال ہو گیا۔ صحبت درہم برہم یار اجباب تتر بتر۔
شیرازہ ہی نہ رہا تو اوراق کہاں کے۔ مگر اس سرزمین میں بلا کی کشش ہے کہ
پاؤں اب بھی نہیں اُٹھتے۔ اس دائرہ اجباب میں ایک صاحب کھانے کا تمباکو
بناتے تھے مگر نسخہ بتایا کیا معنی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دیتی تو کیونکر بتاتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی
بڑھا گئے۔" اور یہاں یہ حالت کہ بغیر اس تمباکو کے پان کا ذائقہ اور مزا نہیں۔
اور بغیر پان کے زندگی کا مزہ نہیں۔ ادھر منہ میں گلوریاں رکھیں ادھر رئیس
صاحب اور وہی صحبتیں یاد آ گئیں۔ خود تو اچھے چلے گئے۔ ہماری زندگی ملیامیٹ
کر گئے۔ ہم کو ساتھ نہ لے گئے لعنت ہے ایسی زندگی پر لعنت ہے ایسے جینے پر
خیر خدا الرزاق ہے کھانے کا انتظام تو ایک۔ دوسرے رئیس صاحب کی تشریف
برادری سے ہو گیا۔ رہا حقہ کبھی خود بھرنے کی عادت تو تھی نہیں یہ شروع شروع
نہ معلوم کتنی چلمیں اُٹھا کر پٹخ دیں نہ معلوم کتنی بار انگلیاں جلیں۔ مگر رفتہ رفتہ
سب ٹھیک ہو گیا۔ البتہ تمباکو کی مشکل نہ حل ہونا تھی نہ حل ہوئی۔ اب کیا

کیا جائے اتنے میں پتہ چلا کہ کوئی اور صاحب فیض آباد میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس بھی کوئی نسخہ تمباکو کا عمدہ ہے۔ تمباکو کی طلب بہتوں کو تھی مگر ہمارے آغا صاحب کو بری طرح لت پڑ چکی تھی۔ بیچارے سب کام چھوڑ کر فیض آباد دوڑے گئے۔ وہ تمباکو بھی کھایا۔ واہ وا۔ یہ تو وہی چیز ہے بلکہ اُس سے بھی بہتر ہے کیا لعاب بندھتا ہے اور جب تک ذرا سا بھی پان منھ میں ہے وہی ذائقہ قائم بلکہ ایمان کی تو یہ ہے تبھی کی تمباکو میں گول دانہ ایسا دیکھا نہ سُنا۔ مگر یہاں بھی نسخہ اسی احتیاط سے بندھتا ہے اور مال اسی طرح تیار ہوتا ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ آغا صاحب نے دوستی پیدا کی ہر وقت ساتھ رہنے لگے۔ جہاں وہ صاحب بازار کو چلے یہ سایہ کی طرح ساتھ ہیں اُنھوں نے پنساری سے کوئی چیز خریدی نہیں کہ آغا صاحب نے بیاض پر نام نہیں لی۔ اُنھوں نے بھی ایک چیز آج لی ایک کل۔ ایک اس دکان سے ایک اُس دکان سے، مگر آغا صاحب ہیں کہ ٹوہ لیتے جاتے ہیں۔ "تم ڈال ڈال تو ہم پات پات"۔ انھوں نے ایک دوا تمباکو کی اگر خریدی تو اسکے ساتھ دو ایک دوائیں پاؤ بھر نمک زر کچور دو ریلیں۔ اب جو آغا صاحب نسخہ تیار کرتے ہیں تو نہ معلوم کیسا سیٹھا پھیکا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ تمباکو کے کیمیا گر کے ایک مطلقہ لڑکی ہے کم سن تو ہے نہیں کوئی چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ مگر ہے تو عورت اور سوا اُس کے بڈھی بڈھے کے اور کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔ وہ مارا۔ ترکیب سمجھ میں آ گئی اُس لڑکی کا پیغام بھجوا دیا

طلاق نہ معلوم کیوں ہوئی تھی ۔ آج تک بیٹھی کیوں رہ گئی اِن سب باتوں کو کون سوچے "درکارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست"۔ یہی ناکہ بدمزاج ہوگی ۔ اجی ہم ایسی خاطر کریں گے کہ وہ ہم سے مزاج کی ایسی لگی ہی نہیں ۔ جب ہم کلیجہ کاٹ کر رکھ دینگے تو کبتک دل نہ پسیجے گا ۔ جب ہم اُن کی راہ میں آنکھیں ہی بچھا دیں گے تو بھنوؤں کی کمان کیسے نہ اُترے گی "ہرچہ کنی رضائے تو"۔ ہم کو تو تمباکو کا نسخہ چاہیئے اس میں جو کچھ برداشت کرنا پڑے اور ممکن ہے کہ کچھ ایسی برکت مِل جائے کہ اِس کی نوبت ہی نہ آئے ۔ کچھ ایسا جوڑ توڑ ملجائے کہ کھٹ پٹ ہو ہی نا چنانچہ رقعہ پہونچا ہی دیا ۔ اے سُبحان اللہ سات پشتوں میں کہیں بال برابر کا بل نہیں ۔ لڑکی والے کیا عیب نکال سکتے تھے ۔ رہی دولت دنیا تو وہ نہ ادھر ہی تھی نہ ادھر ۔ مگر اس کی فکر نہ لڑکی والوں کو ہے نہ لڑکے والونکو ۔ خدائے رب العزت نے کہا ہے یغنیھم اللہ من فضلہ پھر تشویش کس بات کی ۔ لیجیے صاحب جھپاک ہو عقد ہو گیا ۔ آغا صاحب کے نہ صرف بی بی ہی ہاتھ آئی بلکہ تمباکو کا نسخہ بھی مل گیا ۔ نکاح کے وقت ایک ذرا سی گڑبڑ ہوگئی تھی کیونکہ لڑکی والے خاندان کے مراسم کے موافق ایک لاکھ من زرِ سُرخ سے مہر کم نہیں کرتے تھے ۔ اور اُنکے طرفدار اسّی ہزار من سے آگے نہیں بڑھتے تھے ۔ مگر آغا صاحب کے اشتعال سے یہ بھی برداشت کر لیا گیا ۔ اور دلہن رخصت ہو کر ایک کرایہ کے مکان میں اُتار دی گئی رفتہ رفتہ یہی تمباکو کا نسخہ دونوں کا ذریعہ معاش ہو گیا ۔ اور آغا صاحب اور اُن کی اہلیہ کے ساتھ قبر میں دفن ہو گیا"

کمیشن ملتا تھا مگر ایسے موقعے کم ہاتھ آتے تھے۔ بیکاری میں کبھی کبھی ڈھیلے پھینک کے جی بہلاتی تھیں۔ ایک مرتبہ گاؤں میں رات کو ہر گھر میں دس پانچ ڈھیلے گرنے لگے۔ بڑی بڑی اینٹیں آتی تھیں۔ چونکہ گاؤں میں نٹ بیر بابا کا ٹوٹا منہ ہی پکی اینٹوں کا تھا۔ اسلئے لوگوں کا خیال ہوا کہ وہی کچھ خفا ہو گئے ہیں اور یہ حرکتیں کرتے ہیں سب سے بڑی دلیل اس کی یہ بیان کی جاتی تھی کہ اینٹ کبھی کسی کے سر لگی نہیں گاؤں والوں نے نٹ بیر بابا کو خوش کرنے کے لئے کچھ بان دان بھی کی مگر ڈھیلے بند نہ ہوئے۔ ایک دن یہ اتفاق گذرا کہ کسی شخص نے ڈھیلے گرتے وقت ایک نئی بات دریافت کی یعنی ڈھیلے کی "بھد" کے پہلے کچھ کھن سے بھی ہوتا ہے جیسے چوڑیاں بولتی ہیں سننے والے نے میاں حسنو کی بی بی کی ٹوہ لگائی آخر پکڑی گئیں۔ گاؤں والوں نے اچھی خاصی مرمت کی۔ میاں حسنو اس وقت جیل خانے میں تھے اس لئے بہتوں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ حسنو آئیں تو ان کو گاؤں سے نکال دیا جائے۔ حسنو کی بی بی کے لئے پٹنا کوئی نئی بات نہ تھی ان کے میاں اکثر دوسرے تیسرے جوتے جھاڑ دیا کرتے تھے۔ یہ بھی انکی مختصر داڑھی پر حملہ بول دیتی تھیں تب وہ مجبور ہو کر انکے جھونٹے سنوارتے تھے۔ دو چار لاتوں ہزار دو ہزار گالیوں کے بعد میاں بی بی کے جھگڑے ختم ہو جاتے تھے مگر یہ دوسری بات تھی میاں بی بی میں تو سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ غیر مرد کے ہاتھ کی مار کھانا بڑی ناموسی

کی بات تھی اسلئے دوسرے ہی دن کہیں چلی گئیں لڑکے گھر ہی پر رہے ۔ جب میاں ان کے چھٹنے کا وقت آیا تو ایک رات پہلے گھر آرہیں۔ مگر کسی کو منہ نہیں دکھایا حسنو کے آنے کے بعد باسی کڑھی میں صرف ایک خفیف سا اُبال آکر رہ گیا۔ اور پھر نہ ڈھیلے بازی ہوئی نہ اس کا ذکر آیا۔ اور ہمیشہ کی طرح رہنے لگیں۔ اگر ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ اسی گاؤں میں بستے ہوتے تو وہ یقیناً بتا دیتے کہ چونکہ اس کا مرد گھر میں نہیں تھا۔ اسلئے جنسی تقاضے کی وجہ سے بیٹھے بیگار بھلی" کے مسئلہ کے تحت میں ڈھیلے ہی پھینکا کرتی تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نہ ہونے سے معاملہ صاف نہ ہوا۔ کہ ڈھیلے مارے رکھے یا میاں حسنو کی وجہ سے۔

لڑکے دو تھے چھوٹے لڑکے کا تو حال ابھی کھلا نہیں تھا بڑا لڑکا اچھے ہاتھ پاؤں کا لیکن پیٹ بھر کے بیوقوف تھا اگر پوچھو تو گھر میں بس ایک شنگو زا لڑکی کا دم تھا۔ سلیقہ مند محنتی۔ اور ہنس مکھ۔ کچھ کھیت بھی لئے ہوئے تھے مگر ہم نے تو اُن میں کچھ ہوتے بہت کم دیکھا تھا اور زمیندار سے وصولی کے وقت جھنجھٹ کی رسم بندھ گئی تھی۔ نیک نیت کسانوں کی بقایا میں زمیندار سختی بھی نہیں کرتا اور دوسرے کاشتکار بھی ہر وقت نقد اور ضمانت سے مدد کو بھی تیار رہتے ہیں نادہند جس کی ساکھ بگڑ گئی اس کے ساتھ نہ زمیندار رعایت کرتا ہے نہ کسان ہی اس کا ہاتھ بٹاتا یہی حال حسنو بیچارے کا تھا ان کو جیلخانے جانے کی ایسی چاٹ پڑ گئی تھی کہ بعض فصلوں میں زیادہ حصہ کھیتوں کا بغیر جوتے بوئے اکثر

ہی جاتا تھا۔ گھر کے قریب جو دو ایک ٹکڑے تھے وہ اُنکی بیوی کسی نہ کسی طرح تردد کر لیتی تھیں۔ اسکو کھیتی نہیں کہتے۔ بڑے لڑکے اور لڑکی کی شادیاں ہو گئیں تھیں۔ مگر بس ایک بار کے سوا نہ بہو گھر آئی تھی نہ لڑکی سسرال گئی اب یہ کھٹ راگ میری زبانی کہاں تک سنئے گا۔ تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں۔ خود میاں حسنو اور انکی بی بی مجھ سے بہتر بیان کریں گی۔

حسنو کی بی بی۔ بڑی جلدی آ گئے۔

حسنو۔ ہاں، ایک بجے تو چوکیدار ہی پکار گیا تھا۔ اسکے پہلے کیسے جاتے۔

حسنو کی بی بی۔ کچھ ملا۔

حسنو۔ ہاں، اسٹیشن ہی سے تو لوٹ پڑے۔

حسنو کی بی بی۔ کئی بجے ہونگے۔

حسنو۔ تین کا عمل ہے۔

حسنو کی بی بی۔ گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ ابھی تین مہینے پر تو لوٹ کے آئے ہو۔ کل ہی پولیس پھر پکڑ لے گی۔ لاؤ گٹھری ہم کو دو۔

حسنو۔ کہاں رکھو گی۔

حسنو کی بی بی۔ رکھوں گی گھر ہی میں دبا دونگی۔ وہ گیا ہی نکلتے بیٹھا دالان میں کہیں آوے گا۔

حسنو۔ لڑکے تو نہیں جاگتے۔

حسنو کی بی بی :۔ لڑکے کون؟ ۔ لونڈیا شام ہی سے غائب ہے۔ نگوڑی

اسوقت تک دلہن کے نہیں آئی ہے۔ وہ موا ٹانگ پسارے سو رہا ہے۔ اسپر لاٹھیاں ٹوٹیں تب بھی خبر نہ ہو گی حسنو سنو یہ لونڈیا سسری ہماری آبرو لے گی۔ ناک بانسے سے کٹ جائے گی حسنو آئے دو آج اری ڈالوں کا سسری کو حسنو کی بی بی آج کچھ اس نے نئی کی ہے۔ اس کا تو روز کا یہی حال ہے سسرال بھیجو گے نہیں اور ناک چوٹی کاٹنے کو ہر گھڑی تیار۔ جوان لڑکی بھر کیا کرے۔ دوسرے کی بیٹی کو سب ہی بگاڑنے کو تیار رہتے ہیں حسنو اس سالے کے یہاں تو نہ بھیجیں گے چاہے جو کچھ ہو اب اس کے یہاں ہم اپنی بیٹی بھیجیں گے؟ اسی کی گواہی پر تو ہم کو جیل ہوا ہے۔ چاہے سڑ جائے مگر اس کے یہاں تو نہیں جائے گی اور اس حرامزادی کا بھی سر کاٹ لیں گے۔

حسنو کی بی بی، اچھا سنو پیچھے کاٹنا پہلے مجھ کو ہی لیجا دو نہیں تو صبح ہو جائے گی آدھا خرچ گھر کا وہ چلاتی ہے اور یہ اس کا سر کاٹ ڈالیں گے۔ بڑے آئے کاٹنے والے چلے اب نہ کھلاؤ دیو گٹھری لائے ہو۔ نکھٹو جو مال بیچ دیتے ہیں وہ تمہارا مردت سے اپنے اوپر جوکھم اٹھاتے ہیں کہ شکوہ اسکے کہنے سے؟

دوسرا باب

صبح ہو دنی لڑکا لڑکی ابھی سو رہے ہیں۔ عورت رات کے برتن مانج رہی ہے۔ مرد بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔

حسنو کی بی بی۔ جاؤ بہو ہی کو رخصت کر دالاؤ۔ گھر کا دھندا مجھ سے اکیلے نہیں چلتا ہے

حسنو۔ لڑکا کام ہی کا نہیں ہے۔ بہو کس کے برتے پر آوے گی۔

حسنو کی بی بی۔ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ نکاح تو ہوا ہے۔

حسنو۔ نکاح ہوا ہے نکاح ہوا ہے اڑاتی ہو یہاں کیا کوسے گی آکر۔

حسنو کی بی بی۔ سارے آنے تو وہ۔ ہر کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ تم کو تو چار دن بھی اطمینان سے گھر بیٹھنا نصیب نہیں۔ پولیس والوں کو اللہ سمجھے۔ گھر میں دو کی جگہ تین ہو جائیں گے۔ اچھی طرح خاطر سے رکھیں گے تو رہے گی نا کیوں نگر۔ آخر بٹیا نہیں ہتی وہ بھی رہے گی۔

حسنو۔ تو یہ کہو لڑکی والا رنگ اسکو بھی سکھا دو گی۔

حسنو کی بی بی۔ اے ہماری لڑکی کا کون برا رنگ ہے۔ جو تم طعنہ دیتے بیٹھے ہو ہماری لڑکی کسی کی لڑکی سے ہیٹی ہے۔ تم تو وہاں تھے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہم لوگ بھوکوں مر جاتے۔

پڑھنے والو آپ کو معلوم ہوگیا کہ میاں حسنو کے یہاں کام کی تقسیم کیسے تھی۔ انکی بی بی تو حرارت تھیں۔ جو آدمی کو زندہ رکھتی ہے۔ خود میاں حسنو ہاتھ پاؤں تھے۔ لڑکی انکی قلب تھی جو صاف خون جسم میں پہونچاتا ہے۔ اور لڑکی کے چاہنے والے پھیپھڑے تھے جو گندہ خون یعنی چوری کا مال صاف کرکے قلب کو واپس بھیجدیتے تھے۔ بڑا لڑکا ان اعضاء میں تھا جن کو بعض ڈاکٹر صرف اگلے زمانے کی نشانیاں بتاتے ہیں مگر غمزۂ خاص بہر گبر و مسلمان داری۔ جن کا نظام جسم

میں اب کوئی حصہ نہیں ہے۔

میاں حسنو کے یہاں ٹری کا پلٹ ہوئی۔ بڑا لڑکا چیچک میں گذر گیا۔ چھوٹا لڑکا فقیروں کے گروہ کے ساتھ چلا گیا۔ خود میاں حسنو چوری میں پکڑ گئے۔ چوری معمولی تھی مگر غضب ہوا کہ ان پر چوری کی دفعہ ۵۷ لگ گئی اور ان کو پانچ برس کیلئے گئے۔ گھر پر صرف شکورا اور حسنو کی بی بی رہ گئیں۔ مرد تو باہر کی چیز ہے ہی۔ نوکری پر نہ گیا جیلخانے میں رہا اس کی تو حسنو کی بی بی عادی تھیں مگر دو لڑکوں کا اس طرح بچھڑ جانا اس نے ان پر پہاڑ توڑ دیا۔ نہ لڑائی نہ بھڑائی نہ گالم نہ گلوچ۔ حسنو کی بی بی ہکا بکا سی رہ گئیں۔ شکورا یوں تو ہنس مکھ تھیں ہی، دانت نکلے ہی رہتے تھے مگر ننھے اور ٹھلو سے مراسم ذری زیادہ تھے۔ اسکی کھٹک دونوں مردوں کے دلوں میں رہتی تھی مگر کوئی اپنا حق اتنا مرجح نہ سمجھتا تھا کہ دوسرے کو روک دے۔ شکورا اس کا موقع بھی نہ آنے دیتی تھیں۔ ایسی عورتوں کو اسکی عقل خوب آجاتی ہے

ہر یکے فارغ ز غیر و ہر یکے نازاں بخویش ؛ تو لبی را دیدہ و عشرکدہ و جہاں دیدہ ام

ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک انگریزی ناول نکلا تھا جس میں ایک تباہ شدہ جہاز کے پانچ مسافر ایک غیر آباد جزیرے پر آن پڑے تھے۔ چار مرد اور ایک عورت۔ "ملتے ہیں یہ بد قماش لڑنے کے لیئے" کچھ ایسا ہوا کہ چاروں کٹ مرنے پر تل گئے۔ ان چاروں میں سے یہ عورت ایک کو چاہتی تھی مگر اس جزیرے میں زندہ رہنے کے لئے چاروں کی ضرورت تھی لہٰذا وہ عورت

موقع موقع سے چاروں کو حلقہ غلامی میں لاتی رہی یہاں تک کہ ایک جہاز نے ان کو امریکہ پہونچا دیا تب اس عورت نے اپنے چاہنے والے پر یہ راز کھولا۔ وہ بھی کچھ ننھے ٹھلو کی طرح الو کا پٹھا تو تھا نہیں اس لیے سمجھ گیا اور ایسی بی بی ہاتھ لگنے پر اللہ کا شکر بھیجا۔ اگر آدمی امریکہ کے لوگوں کی طرح پڑھکر فاضل نہ ہو گیا تو رقابت کی آگ کبھی دہک اٹھتی ہے کبھی راکھ میں دبی سلگا کرتی ہے۔ مگر بجھتی نہیں یہاں بھی یہی ہوا کہ ایک خاص بے موقعہ وقت پر دونوں کی مٹھ بھیڑ ہو گئی اور خوب کشتی ہوئی۔ جانوروں میں ایسے موقعہ پر عورت محفوظ رہتی ہے مگر آدمیوں میں کبھی محبت کے اظہار کے لیے کبھی مرجع حق سمجھنے کی وجہ سے کبھی محبت کا بھرپور ثبوت دینے کیلئے عورت بھی جھپیٹ میں آجاتی ہے۔ بقول اسکر وائلڈ کے کوئی چاہنے والا بوسہ لیکر مار رکھتا ہے کوئی تلوار سے بوسہ لیتا ہے"

چنانچہ جب ٹھلو ننھے کی خوب مرمت کر چکے تو شکورا کی طرف متوجہ ہوئے اور دو چار لاتیں ایسی دھریں کہ جریدۂ محبت پر دوام کی مہر لگ گئی۔ اور ٹھلو کی سچی محبت کا شکورا کو یقین ہو گیا عورت کو اور کیا چاہیئے۔ شکورا نے اللہ کا شکر بھیجا اور نسوانیت کے تمام صفات مثل قربانی، وفاداری، استقلال یکرنگی کے ابھر آئے۔ عورت کی روح نے تن من دھن کی بازی لگائی تھی۔ پانسہ الٹا پڑا۔ آؤ سکھی مل چوسر کھیلیں پی اپنے کے ساتھ۔ جیتیں تو پی کے ہاریں تو پی کے ہاتھ۔ اسی

طرح شکورا کی بھی ہار بن جیت نکلی اور دوسرے دن گاؤں میں نہ شکورا کا پتہ تھا نہ ٹھلو کا۔

شکورا کے جانے کے بعد حسنو کی بی بی بلبلا اٹھیں گھر باریوں ہی چھوڑ چھاڑ شکورا کو ڈھونڈھنے نہ معلوم کہاں نکل گئیں۔ ٹوٹی منڈیا برسات میں ہموار ہو گئی۔ کھیت دوسروں کے قبضے میں چلے گئے گاؤں میں لوگ ان لوگوں کا نام بھی بھول گئے۔

ظاہرا قصہ ختم ہو گیا۔ مگر جو کچھ میں پیش کرنا چاہتا تھا وہ باقی ہے اگر بیکاری یا کسی اور وجہ سے اب بھی پڑھنے کا خیال باقی ہو تو بسم اللہ۔

ان واقعات کے تقریبا بارہ تیرہ برس بعد حسنو کے قدیم مکان سے تین سو میل پر ایک بارات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک صاف صوف چھوٹا سا کچا گھر دیکھا۔ اس کے دروازے کے سامنے یہ چرخہ کون کات رہا ہے۔ ارے حسنو کی بی بی تم یہاں کیسے حسنو کی بی بی۔ میں تو آپ میں رہتی ہوں۔ ہئیں گھر تو تمھارا خوب صاف صوف ہے۔ جی ہاں اللہ کا شکر ہے۔ کہو تو یہاں تو کیسے پہونچیں حسنو کی بی بی ارے بڑی لمبی کہانی ہے گھڑی بھر میں سب کچھ کیسے کہہ جاؤں۔ اور ارے لو تمھارا تو شین قاف بھی درست ہے تم تو بالکل ہی بدل گئیں۔ کچھ کاغذ پنسل وغیرہ طاق پر دیکھ کر۔ ارے اس بڑھاپے میں پڑھنا بھی سیکھ لیا۔ جی نہیں یہ چیزیں تو بھیا کی ہیں۔ (مگر کچھ شرما کر) دو تین کتابیں بھیا نے قسمیں دیکر مجھکو بھی

بڑھائی ہیں۔ بھئی واہ وا۔ اس سن میں تم نے پڑھنا سیکھا۔ اور بھیّا کون تمہارا چھوٹا لڑکا تو فقیروں کے ساتھ چلا گیا تھا حسنو کی بی بی۔ (چہرے پر کرب کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ ذرا رک کر) جی نہیں یہ میری اولاد نہیں ہیں میں نے تو پالا ہے۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اگر موقع ملے تو آپسے اپنا اور بھیّا کا پورا حال کہہ سناؤں۔ آپ بارات میں آئے ہونگے کل صبح کو جائیے گا۔ آپ امیر آدمی ہیں میں آپ کیسے کہوں اگر شام کے وقت آپ کو چھٹی ہوتی تو ذرا چلے آتے اور میری کہانی بھی سُن لیتے اور بھیّا کو بھی دیکھ لیتے۔

میں حسنو کی بی بی جس طرح ہو گا میں ضرور آؤں گا۔ تم تو بالکل ہی بدل گئیں۔ دُوسری ہو گئیں۔

حسنو کی بی بی۔ اب ہمارے بھیّا کو دیکھ لیجیے گا تب کچھ کہیے گا۔

اس طرح کی قلب ماہیت ہوتے میں نے نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ یہ وہی عورت ہے یا کوئی دوسری روح اس میں حلول کر گئی ہے اس کو اگر میں نے کبھی نیا کپڑا پہنے بھی دیکھا تھا تو سوا پھوہڑ بن کے اس میں اور کچھ نہیں۔ آج بھی کپڑوں میں پیوند دکھائی دیتا تھا مگر یہ صفائی کا سلیقہ۔ کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ہمیشہ لڑائی میں بکھڑیے کا انداز صلح میں اس کتے کی سی حالت جس نے سوا دوت کے اور کچھ نہ جانا ہو اور آج یہ رنگ ہے کہ چہرے پر خود اعتمادی

کا سکون۔ غریبی میں دولت کی ایسی قناعت۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔

چار بجے میں نے اپنے میزبان سے کہا کہ گھڑی بھر کے لیئے میں ایک آدمی سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔

میزبان۔ اس قصبے میں کون آدمی آپ کا جاننے والا نکل آیا۔

میں۔ میرے گھر کے پاس ہی ایک موضع ہے۔ جس میں ایک عورت رہتی تھی۔ آج میں نے یہاں آتے وقت اس کو دیکھا اور اس سے وعدہ کیا تھا تھا کہ تیسرے پہر کو میں آؤں گا۔

میزبان۔ ارے وہ پردیسی بی بی تو نہیں جنکا گھر گاؤں کے نکڑ ہی پہ ہے یہاں۔۔۔ آتے وہ گھر پہلے ہی ملتا ہے۔

میں۔ جی ہاں، وہی۔

میزبان۔ وہ بڑی اچھی عورت ہے۔ اس کا لڑکا بھی ہونہار ہے۔ تو یہ آپ ہی کے یہاں کی رہنے والی ہیں۔

میں۔ جی ہاں۔

میزبان۔ آٹھ نو برس ہوئے یہ عورت یہاں آکر بسی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شریف ہے کیونکہ طریقہ باوجود غریبی کے بڑا عمدہ ہے سلائی اور چرخے کے علاوہ کوئی آمدنی نہیں۔ یہ گھر کھنڈر تھا اب کیسا ٹھیک ٹھاک کیا ہے بستی بھر میں سب سے پہلے مٹی اسکے گھر میں لگ جاتی ہے پر چھتیاں پڑ جاتی ہیں۔ دیکھیئے تو ایسا صاف

صوف جیسے بانجھن کا آنگن۔ غریب ہے مگر ہمارے گھر میں وہ تھا ست نہیں
جو ان کے یہاں نکلتی ہے۔ پارسال وہ لڑکا بیمار ہو گیا تھا میعادی بخار تھا
حکیم صاحب کے ساتھ میں بھی چلا گیا تھا ہر چیز دیکھ کر دل پر یہ اثر ہوا کہ اگر
عورت سوگھڑ ہو تو کم سے کم آمدنی میں بھی آرام کا سامان اکٹھا کر لیتی ہے علاج
کے سلسلہ میں صاف صوف بوتلیں وہ ایک نئے شیشے کا گلاس ہر چیز موجود۔ اس
سے چوگنی بلکہ دس گنی آمدنی والے ہیں کہ جن کے یہاں وقت پہ چیز نہیں نکلتی اور
ان کے یہاں جیسے ہی ہم گئے نئی دری نکال کر ہم لوگوں کے لئے دوسرے پلنگ
پر بچھا دی۔ پان تو تھے نہیں تشتری میں الائچیاں نکال کر رکھ دیں۔ صاف
تیلیاں صاف چولہا دیکھ کر جی خوش ہو گیا لڑکا بھی ہونہار ہے مدرسے میں
ہمیشہ اوّل انعام پاتا ہے دوسرے تیسرے دن میں پھر گیا تو دیکھا کہ بیمار کے
لئے ہر چیز موجود ہے۔ اوٹایا ہوا پانی ایک نئے جھجھر میں اوپر سے ایک نیا سکورا
بند۔ گھر اونچی نہیں ہے مگر یہ نہیں کہ گھڑے یوں ہی زمین پر لوٹ رہے ہوں۔
اینٹوں کے اوپر تمیز داری سے رکھے ہیں۔ بیمار کے پاس ہی جھجھر بھی اینٹوں پر
رکھا ہے۔ دوا پلانے کا پیالہ گلاس بھی اسی طرح جما دیئے گئے ہیں۔ یہ کون گر میں!
میں یہ شاہو کا خاندان ہے۔
میز بان۔ یہی تو میں کہتا تھا جب تک کسی آستانے سے توصل نہ ہو جب تک
کوئی بڑی نسبت نہ ہو یہ باتیں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔

میں۔ (ہنسی ضبط کرنے کی سخت اور کامیاب کوشش کے بعد) جی ہاں اور نہیں تو کیا۔

میزبان: میرے دل میں یہ بات ہمیشہ سے تھی آج تصدیق ہو گئی نا۔ ضرور یہ بی بی رسیدہ ہیں، ظاہرہ دنیاداری کا بنارہ رکھا ہے صاحب۔ تو میں ان سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہنسی ضبط کرنے میں میرے پیٹ میں پھر گدگدی شروع ہوئی مگر پہلے کو بات بن گئی اور میں سنجیدگی برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا۔ دوسری خیر یہ گذری کہ میزبان صاحب نے مہمانوں کی خاطر مدارات کے خیال سے فیض کی تحصیل اُسی وقت شروع نہیں کر دی نہیں تو اگر اسی وقت میرے ساتھ ہی روحانیت بڑھانے کو اُٹھ کھڑے ہوتے تو ہمارا کھیل ہی بگڑ گیا تھا۔

پردیسی بی بی میرا انتظار ہی کر رہی تھیں۔ گھر میں دو پلنگ بچھے تھے تیسرا دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ گھر بس سہ دری۔ اسکے پیچھے کوٹھری۔ انگنائی میں بائیں طرف ایک چھوٹا سا یکدرے کا باورچی خانہ۔ ہر چیز صاف ستھری۔ طاق پر لڑکے کی کتابیں۔ کونے میں لالٹین۔ ایک پلنگ پر بچھونا لپٹا ہوا سرہانے رکھا تھا دوسری پر دری اور چادر تھی۔ مجھکو پلنگ پر بٹھایا اور خود زمین پر بیٹھ گئیں۔ میں نے بہت کہا کہ دوسری چارپائی پر بیٹھ جائیے مگر انھوں نے نہ مانا۔ لڑکے سے ملایا۔ کوئی گیارہ برس کا رہا ہوگا۔ صورت شکل سے پردیسی بی بی کو اس سے کوئی نسبت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کچھ دیر لڑکے سے باتیں کیں۔ چھٹے درجے میں پڑھتا تھا۔ جسنے کی بی بی اور یہ لڑکا۔ یہ گھر۔ مجھکو ایک شعر یاد پڑا ہے

نہ دل میں بدی ہو نہ کینہ نہ بیر　　　یہ گھر صاف ہو ہو کے دکھلائے سیر

مرزا محمد ہادی مرحوم رسوا نے ایک اسی طرح کا حال لکھا ہے۔ مگر وہاں خاندانی روایات ماں اور لڑکے کے ایک سے تھے یہاں بالکل مختلف کیونکہ عورت اور لڑکے کے خاندانی روایات میں کوئی نسبت نہ تھی۔ اگر میں نے خود نہ دیکھا ہوتا تو لکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔

پھر پردیسی بی بی نے ایک پیالی چائے اور دو برفی کی ڈلیاں میرے سامنے رکھیں مروت سے زیادہ جس چیز نے کھانے پر آمادہ کیا وہ یہ خیال تھا کہ اس عورت کے ہاتھ کا کوئی بیر نہ کھاتا اور آج صفائی، سلیقہ، غریبی تینوں چیزیں موجود تھیں لڑکا تو تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا پردیسی بی بی نے اپنی داستان شروع کی۔

میرے اوپر جب آفت آئی اور شکوڑا بھی چلی گئی تو میں کس کے سہارے گاؤں میں رہتی۔ جہاں جہاں خیال ہوا کہ وہ ہوگی وہاں گئی۔ جب بالکل بے آس ہو گئی تب بھی گھر جانے کا ہوا نہ بندھا ٹکڑے مانگ مانگ کر دن کاٹا کی۔ جب ایک جگہ سے تھک جاتی تھی تو دوسری جگہ چلی جاتی پھر ریل پر چلنے لگی۔ کبھی کبھی ریل والوں نے اتار بھی دیا۔ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ میں اپنے گھر سے پیدل کے راستے پہلے گونڈے گئی تھی بہت دنوں تک اِدھر اُدھر گاؤں گاؤں کی خاک چھانا کی مگر شکوڑا کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس کے بعد ریل پر چڑھ کر بارہ بنکی پہونچی وہاں معلوم ہوا کہ شکوڑا کے باپ بھی چل بسے۔ میں لکھنؤ چلی گئی۔ اسی طرح ایک

مرتبہ نکیسم پور کے پاس ایک اسٹیشن پہ اتار دی گئی۔ بھیک مانگتی تھی اور پیٹ بھر کے لیے ہمیشہ مل جاتا تھا مگر جی نہ معلوم کیا ڈھونڈھتا تھا۔ ایک دن ایک دروازے بھیک کے لیے گئی۔ گھر کی بی بی نے اندر بلا لیا۔ اچھے خاصے زمیندار کا گھر تھا۔ گھر کی بی بی کا کوئی بیس برس کا سن میاں کا سن چالیس سے اوپر رہا ہوگا۔ باہر تو نوکر چاکر سب دکھائی دیتے تھے مگر اندر سوا ایک لڑکے کے کوئی نہیں تھا میں نقیر اہر دروازے کا ٹکڑا کھانے والی اُنھوں نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ یہاں چلی آؤ مگر مجھکو جیسے زمین نے کھینچ کر کھڑے سے بٹھا دیا۔ بی بی آدمی کی صورت کو ترستی تھیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ بیٹا میرا کل مجھکو ایک کتاب سنا رہا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ بندر کتے کسی بر گھوستے بھونکتے ہیں کسی کے پاس چپ چاپ چلے آتے ہیں یہی حال میرا ہوا۔

میں ہر جگہ سے دُتکاری جاتی تھی راہ گلی کے کتے اور میری حالت ایک تھی مگر نہ معلوم کیوں اُن بیگم صاحب کے پاس پہونچکر میری بھی وہی حالت ہوئی جو بھیا نے جانوروں کی بتائی تھی کل جیسے ہی اسنے یہ بات پڑھی مجھکو اپنی بیگم صاحب اور نکیسم پور کا گاؤں یاد آ گئے۔ اب کہانتک کہوں میرا اس گھر سے جانے کو جی نہ چاہا۔ بیگم صاحب جو جو باتیں کرتی تھیں میرے اندر کوئی مجھ سے کہتا تھا اب تم اِنھیں بیگم صاحب کی ہو گئیں۔ انکے پیٹ میں دونوں کا لڑکا تھا امیر آدمی اور ایسے آڑے وقت اکیلا ہونا اس کو کچھ عورت ہی سمجھ سکتی ہے میں

وہیں رہ گئی رہتے رہتے سب حال معلوم ہو گیا۔ انکے میاں دو بھائی تھے بڑے
یہ چھوٹے پاس ہی دوسرے گھر میں رہتے تھے جتنی جائداد ان کے تھی اتنی
ہی دوسرے کے۔ انکے کئی بال بچے تھے اور بڑے بھائی تن تنہا تھے انکی بی بی
کئی برس ہوئے مر چکی تھیں سن زیادہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کا خیال
نہ تھا۔ اس کے علاوہ بڑے میاں اپنے بھائی کے بچوں کو بہت چاہتے تھے۔ وہ
بھی ہر طرح کی تابعداری اور محبت کیا کرتے تھے۔ اور دونوں گھروں میں انہیں کا
کہنا چلتا تھا۔ ان کا زیادہ روپیہ بھی سوا ان کے اور کس پر خرچ ہوتا۔ روپے پیسے
پر کچھ ملال ہو گیا یہ باتیں بیگم صاحب بتایا کرتی تھیں۔ ایکدن ایسا اتفاق ہوا کہ
بھائی کے یہاں سے حلوہ آیا میاں نے کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد طبیعت خراب
ہوئی۔ پیٹ میں درد قے پہ قے۔ پیاس کی شدت کچھ پوچھو نہیں خدا کا کرنا ایسا کہ
سب حلوہ وہ ہی اس قے میں گر گیا۔ میاں بچ گئے یہ بات میاں نے چھپا ڈالی
مگر مہینوں چارپائی لگے رہے۔ جب اچھے ہوئے تو کہیں جونپور کی طرف سے
نکاح کر لائے۔ اتنی دور کی بات کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ جتنے منھ اتنی زبان
جتنی زبانیں اتنی باتیں۔ مگر بیگم صاحب کے بارے میں اچھی بات کسی نے نہ کہی
بھائی کے گھر سے پہلے ہی تکلف ہو چکا تھا اب تو کھلم کھلا بگاڑ ہو گیا آمد و رفت
تک بند ہو گئی۔ اب وہ انکے گھر والے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر بیگم میاں بی بی
کی برائی کرنے لگے۔ لڑکا ہوا تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر آسمان ہی پھٹ پڑا۔

روپیہ نگوڑا ایسی چیز ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن بنا دیتا ہے۔ یہی بھتیجے تھے جو سنتی ہوں تکلف ہو جانے کے بعد بھی کہا کرتے تھے کہ بزرگوں کی باتوں میں ہم کون بولنے والے ہمارے جیسے یہ بزرگ ویسے وہ۔ مگر جلن ڈاہ تو آدمی کے ساتھ ہے۔ جب میاں نے دیکھا کہ کھاؤ بھی اور غصے ڈبے بھی دکھاؤ حسد اوپر سے تو انھوں نے بالکل ہی ہاتھ سمیٹ لیا۔ پھر کیا تھا وہ پرانی سعادتمندی، احسانمندی، یگانگی سب تہہ کر کے رکھ دی اور جان مال آبرو کے دشمن ہو گئے۔

ہاں ایک بات نہیں بتائی جب لڑکا دو تین مہینوں کا ہوا بیگم صاحب نے کہا بھیا کو ادھر چاہے جہاں لے جانا لیکن خبردار چھوٹے میاں کے یہاں نہ لیجانا۔ یہ بات میری بھی سمجھ میں آئی۔ کیونکہ یہ لوگ راستے گلی میں بھیا کو میری گود میں دیکھتے تو خدا واسطے کو ایک آدھ آوازہ کس دیتے۔ اب دشمنی اور کھل گئی میاں کے بھتیجی بھتیجوں میں چھوٹے بڑے لوٹے تھے جو ان سب ایک خیال کے ہو گئے۔ جب سے بچہ ہوا تھا ماں باپ بھی جیسے دنیا میں پھر سے آ گئے گھر میں رونق بڑھ گئی تھی۔ آدمی کی صورت جو پہلے دکھائی نہ دیتی تھی اب دکھائی دینے لگی۔ نوکروں میں دو ہی آدمی تھے یا ماما لڑکا جو اوپر کا کام کرتا تھا یا میں۔ کھانا بھی اس وقت تک باہر ہی پکتا تھا اب ایک پکانے والی بھی مل گئی کھانا بھی اندر پکنے لگا۔ اور میں بچے کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ تین برس بڑی

اچھی طرح کٹے۔ اس کے بعد طاعون پڑا۔ گاؤں کا گاؤں صاف ہو گیا۔ یہاں تک کہ جو لوگ گھر چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے ان میں بھی ایک آدھ مرے اس کے بعد ایک ہی دن میں ہمارے میاں بی بی پڑے اور چار دن میں پہلے بی بی اور پھر میاں چل بسے۔ باہر کے بھی کئی نوکر مر گئے۔ چھوٹے میاں کا حملہ دخلہ بیماری ہی سے ہو چلا تھا۔ ابھی اندر عورتیں تو کوئی نہیں آئی تھیں۔ مگر باہر نوکر چاکر اور خود میاں کے چھوٹے بھائی آ گئے تھے۔ تین راتیں اس گھر میں بھیا کو لے کر جو میں نے کاٹی ہیں وہ مجھ کو نہ بھولیں گی میری آنکھوں میں دنیا اندھیری تھی حواس اور عقل سب رخصت ہو چکے تھے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں زندہ ہوں کہ مر گئی ہوں کہ کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ کھانا کھاتی تھی تو سواد نہیں ملتا تھا سوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ جاگ رہی ہوں جاگتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ سو رہی ہوں۔ چوتھی رات تھی میں بھیا کو لئے لیٹی تھی کہ خواب دیکھا کہ میرے بھیا کی طرف بہت سے شیر بھیڑیے اور جانے کیسے کیسے جانور دوڑے چلے آتے ہیں اور میں چیل ہو کر منڈلا رہی ہوں۔ بس ایکبارگی میں ٹوٹی اور بھیا کو پنجوں میں لیکر اڑ گئی اب جو جاگی تو سارا جسم پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے طاقت جی دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ ذرا حواس جمع بھی ہوئے تب بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ جانور ابھی تک ہیں۔ بس میاں میری سمجھ میں یہی آیا کہ بھاگو۔ اندھیری رات تھی میں نے بھیا کو گود میں لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی جو لڑکا نوکر تھا وہ بے خبر سو رہا تھا اگر

میں کچھ مال، ساتھ لانا بھی چاہتی تو گھر بھر میں قفل پڑ چکے تھے کیسے لاتی۔ مگر اس کا خیال کس کو۔ جب دروازے کے پاس پہونچی تو خیال ہوا کہ بھیا کے کپڑے لے لوں۔ بھیا کے کپڑے میرے ہی پاس رہتے تھے بیگم صاحب نے ایک صندوق مجھکو دیا تھا۔ اس میں انکے اور اپنے دونوں کے کپڑے رکھتی تھی۔ لوٹ کر صندوق سے کپڑے نکال لیے ایک گٹھری باندھی بیگم صاحب نے چاندی کا کچھ گہنا مجھکو بھی بنوا دیا تھا وہ بھی میں نے لیا اور اپنا ایک جوڑا بس لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ بھیا کے مونڈن اور ختنے میں مجھکو بڑے اچھے جوڑے ملے تھے مگر میں نے وہ رہنے چھوڑے جو کچھ انعام اکرام میں مجھکو ملتا تھا بیگم صاحب وہ اپنے ہی پاس رکھتی تھیں اور مجھکو زیور بنوا دیا کرتی تھیں۔ اب بھی بیچاری کے پاس کچھ روپیہ جمع تھا یاد نہیں کتنا۔ گہنا اور سات روپئے جو صندوق میں تھے۔ بس یہی لیکر میں چل کھڑی ہوئی۔

اندھیری رات مگر میں اندھیرے سے کیا گھبراتی۔ گاؤں سنسان تو تھا ہی۔ الّو بول رہا تھا۔ مجھکو کون ٹوکتا صبح ہوتے ہوتے ایک ندی پار کر کے شاہجہانپور کی طرف چلدی۔ تین برس کا بچہ ماں باپ سے جب سے چھوٹا تھا کچھ سہم ایسا گیا تھا۔ گم سُم نہ روتا تھا نہ منھ سے کچھ کہتا تھا بس ہر وقت مجھکو چمٹا رہتا تھا نہ معلوم کس چیز سے ڈرا ہوا معلوم ہوتا تھا اب کہاں تک مصیبت بیان کروں دو مہینے گھومنے پھرنے کے بعد اس قصبے میں پہونچی۔ یہ مکان گرا پڑا ایک سا تھا۔ خیر کسی طرح ٹھکانا ہو گیا۔

دو مہینے در بدر ماری ماری پھرا کی ایسے وقت میں جو فقیرن نہ ہوتی وہ بھی مانگنے لگتی مگر بھیا گود میں تھا۔ مجھ سے ہوا ہی نہیں کہ اس کو خیرات پر پالوں جب اس گھر میں آئی تو یہیں ایک ٹوٹا چرخا پڑا ملا۔ اس کی مرمت کروالی اور سوت کاتنے لگی۔ ہماری بیگم اللہ جنت نصیب کرے سینے پرونے میں بڑی ہوشیار تھیں تین برس اگر ہاتھ سے نہیں کیا تو آنکھوں سے تو ہر طرح کا کام دیکھا تھا۔ وہ کام تو میرے فرشتے بھی نہیں کر سکتے تھے مگر سیدھا سادھا مجھکو بھی آگیا اب اڑوس پڑوس سے اتنا کام مل جاتا ہے کہ صبح سے شام تک اپنا اور بھیا کا پیٹ پال لیتی ہوں اور جب سے قسط کے اوپر مشین ہو گئی ہے تب سے کچھ نہ کچھ بچا بھی لیتی ہوں۔ کیونکہ سال بھر کے بعد بھیا کے یہاں پڑھنے لکھنے کا سامان نہیں ہے اور اگر مر نہ گئی تو اس کے پڑھانے کا بندوبست تو ضرور کروں گی اگر کسی طرح نہ ہوا تو بھیا کو مدرسے بھیجدوں گی اور میں پھر بھیک مانگ کر اس کا خرچ چلاؤں گی۔

میں۔ خدا پر بھروسہ رکھو تمھاری ہمت ایسی ہو کہ اپنے لڑکے کو پڑھا لوگی۔

پردیسی بی بی۔ منشی جی میں جنم جنم کی فقیرن۔ بچپن سے یہی دیکھا۔ یہی کیا۔ مجھکو بھیک مانگنے سے سہل کون چیز پڑتی۔ میرا اور بھیا کا پیٹ پل جاتا۔ مگر نہ معلوم کیا ہو گیا ہے کہ لوں تو اللہ بھلا کرے ہر وقت منھ پر رکھا

رہتا ہے مگر جب بھیتا پاس ہوتا ہے تو نہ تو یہہ ہاتھ ہی پھیلتا ہے اور نہ منہ سے سوال ہی نکلتا ہے —

بیگم تم کروٹ کروٹ جنت میں رہو۔ تم نے اور تمھارے بیٹے نے میری دنیا سنوار دی۔ بیگم کچھ نیلم کے نگ کی بات کیا کرتی تھی کہ جسکو راس آجاتا ہے وہ بہت سُکھ پاتا ہے۔ منشی جی میرا بھتیا وہی نیلم کا نگ ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کمبخت وہی ٹکڑہ گدی ہوں۔

راجہ پربھتی پال سنگھ

پودوں میں ایک قسم ہوتی ہے جن کو انگریزی "پیراسائٹس" کہتے ہیں اپنے ملک کی زبان میں اُن کو بیل کہہ لیجئے ان میں یہ بات ہوتی ہے کہ دوسرے کے بل بوتے پر خوب پھیلتے ہیں۔ اگر بیل زمین پر بو دیجئے تو تھوڑے سے بڑھ کر رہ جاتے ہیں اگر کوئی چیز ایسی پا گئے جس پر چڑھ سکیں تو جی بھر کر پھولتے پھلتے ہیں ہمارے بچپن کے یار۔ ساتھ کے کھیلے ساتھ کے پڑھے راجہ پربھتی پال سنگھ تعلقدار سورجپور کی افتاد طبیعت ایسی ہی تھی اگر اس بات کو یاد رکھیگا تو انکی زندگی کا ہر پہلو انکے ہر قول ہر فعل ہر کام کی چھپی ہوئی تہہ آپ پر کھل جائے گی میرا اُن کا ساتھ کالون تعلقدار کالج جو اس زمانے میں اسکول کہلاتا تھا ۱۸۹۲ء سے ہوا۔ یہ کوئی گیارہ برس کے ہونگے اور میں دس برس کا تھا پربھتی پال سنگھ کی خصوصیات حسب ذیل تھے۔ صاف دلی، ذہانت، نیکی، بعض باتوں میں بہت نڈر بعض باتوں میں بڑے ڈرپوک مثلاً اندھیرے میں ہُو سے کر دو تو بیہوش ہو کر گر پڑیں، بجلی چمکے تو لحاف سے مُنہ بند کر کے لیٹ رہیں۔ اگر بات پر اڑ جائیں تو چاہے جان ہی جائے اسپر قائم رہیں۔ دوست احباب کے کام آنے کے موقعے ڈھونڈھا کریں موٹے تھلتھلے آدمی تھے۔ فٹ بال فیلڈ میں خود فٹ بال معلوم ہوتے تھے ٹینس غنیمت کھیلتے تھے۔ گھوڑے پر اچھا چڑھ لیتے تھے

اُن کی عشق پیچاں والی افتادِ طبیعت کا پہلا نمونہ جو میں نے دیکھا وہ یہ تھا کہ ہمارے رائٹنگ اسکول کے دفعدار کے مرید ہو گئے دفعدار بیچارہ اَن پڑھ سرکاری نپشن خوار سپاہی بھرتی ہوئے اور دفعداری سے نپشن پائی پرتھی پال سنگھ کے مشیر تھے۔ انگریزی کپڑے بنوائیں گے تو دفعدار سے مشورہ کرکے ٹینس کا بلا خریدیں گے تو دفعدار سے پوچھ کے حتیٰ کہ کوئی کتاب بھی مول لیں گے تو دفعدار سے صلاح لینے کے بعد ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ سلسلہ پڑھے لکھے جاہل نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ عمر بھر جاری رہا۔ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھے۔ مذہبی تعصب کہیں چھو تک نہیں گیا تھا۔ جوکا برتن تو بڑے احتیاط سے ہوتا تھا مگر چھوت چھات سے پیدائشی نفرت تھی۔ اتنی جرأت نہیں تھی کہ بندرہ سولہ برس کے سن میں کھلم کھلا ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے مگر چوری چھپے کسی چیز سے پرہیز نہیں تھا اسکے بعد دو آدمیوں کا اثر انکے اوپر بہت پڑا ایک کورٹ آف وارڈس کے ہیڈ کلارک تھے اور دوسرے میرے خیال میں ایک تھیاسوفسٹ وکیل تھے۔ کلرک نے تو شیمبن اور گورکی کے آزاد خیالی اور ازادروی کی راہ لگائی۔ بڑی بڑی داڑھی والے وکیل زیادہ اہم باتوں کیطرف لے گئے۔ پولٹیکل خیالات ہندو مسلم فرقے۔ ملک کی بہبودا

انگریزوں سے نفرت۔ یہ باتیں پختہ ہونے لگیں اس جگہ پر بھی پال سنگھ کی مضبوطی کا ایک واقعہ سن لیجئے یقیناً ہم لوگ ۱۹، ۲۰ برس کے رہیں ہونگے ہم لوگونکے علاقے ابھی تک کورٹ کے انتظام میں تھے فیض آباد میں ایک کمشنر تھا جو نہایت منصف مگر بہت بد دماغ آدمی مشہور تھا۔ علاوہ اور باتوں کے ایک سنک اس میں یہ بھی تھی کہ اگر لوگ اس سے ملتے نہیں تھے تو وہ بُرا مانتا تھا بعض انگریز تھے جو زیادہ ملاقاتیوں کا آنا پسند نہیں کرتے تھے اسلیئے ہم غریب بالغوں کو بڑی دقت پڑتی تھی حکام میں کوئی غرّاتا تھا کوئی دم ہلاتا تھا اور ہم بدقسمتوں کو ملنے کے پہلے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ انگریز غرّانے والا ہے۔ یا دم ہلانے والا۔ بعض تھے جو غرّاتے بھی تھے اور ساتھ ہی دم بھی ہلاتے جاتے تھے ان کا سمجھنا سب سے مشکل تھا کہ کس سرے کا اعتبار کیا جائے چنانچہ سب سے پہلے اس کمشنر نے ایک بوڑھے ذی عزت تعلقدار کو جھنجھوڑ کھایا اُن سے اس نے پوچھا آپ ہم سے کبھی اور ملے ہیں اُنھوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا تو ہم آپ سے نہیں ملنا چاہتا۔ یہ کہہ کر اٹھ گیا یہ بیچارے بہت شرمندہ ہوئے۔ انکو عمر بھر میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا، انکی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل ہے اس کے بعد یہی مصیبت مجھ پر پڑی میں مبہوت رہگیا۔ اور اٹھ کر چلنے لگا لیکن اس نے پھر بٹھا لیا مگر مجھ سے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتا تھا تیسرا واقعہ پرتھی پال سنگھ کا ہوا ان سے بھی اس نے یہی کہا اُنھوں نے جواب دیا مجھکو بڑا افسوس ہے کہ میں ایسے گستاخ آدمی سے ملنے آیا اور اٹھ کر چلے آئے اسکے

بعد سے اس کے کان ہو گئے اور پھر اس طرح کی حرکت اس کی سنی نہیں گئی۔ بغیر پہلے اور بعد کا لحاظ کئے ہوئے ہمارے دوست کا ایک اور واقعہ سُن لیجئے جو تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہے۔ اسوقت ہم لوگوں کا سن اور بھی کم تھا۔ مگر ٹھیک وقت یاد نہیں۔ بڑے دن کی چھٹی ہونے کو دو تین دن باقی ہیں دل کی خوشیاں بڑھ رہی تھیں رات کے تقریباً آٹھ بجے ہونگے پرتھی پال سنگھ ہیڈ ماسٹر کے پاس پرائیوٹ ٹیوشن لے رہے ہیں پڑھنے کے بعد رخصت ہوتے ہیں برآمدے میں اندھیرا ہے کونے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالا بھجنگ آدمی دس فٹ کا قد مٹکے کا ایسا سر لئے کھڑا ہے۔ یہ ایک چیخ مار کر پھر کمرے میں گھس گئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب پر بھیٹ پڑے جھڑپ جو لگی تو لمپ بھی گر کر بجھ گیا۔ اچانک واقعہ ایسا ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب تھے بھی پرتھی پال سنگھ کی چیخ میں چیخ ملائی نوکر جب تک آویں آویں کالا دیو رفو چکر ہو گیا تھا لمپ جلا تو لوگوں کے حواس بجا ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب جو صفائی اودھم میں بیٹھے تھے اور اسوقت جو کرسی کے گدے کا کام بھی دے رہی تھی صبح کو بیچ میں دھوئی نچوڑی ہیڈ ماسٹر صاحب کی دیوار پر پھیلی تھی۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے خطا ہو گئی یا پرتھی پال سنگھ سے آج تک نہ دریافت ہو سکا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد آزادی کے خیالات زیادہ ہو گئے علاقہ بھی کورٹ سے چھوٹ گیا عالی ہمت آدمی تھے ہاتھ بھر کا کلیجہ تھا جو کام کرتے تھے بڑے پیمانے پر ہوتا تھا اگر کسی کو دیں گے تو اس کی اُمید سے زیادہ اگر مکان کی بنیاد ڈالیں گے تو ایسی کہ دو منزل کا اگر نوا ہار

تو تین منزل سنبھال لیے۔ اگر ہنسیں گے تو جی بھر کے بچپن میں اگر غصہ کریں گے تو اُسی طرح جی بھر کے چنانچہ ایک مکان بنوایا کلکتہ کے مشہور انجینئرس مارٹن اینڈ کو کو ٹھیکہ دیا تھا۔ اس زمانے میں ڈھائی لاکھ کا مکان آج دس لاکھ کا اسٹیمیٹ بیٹھتا دو منزلیں تیسرا ہوادار گنبد غسلخانے اوّل درجے کے جس میں اسپرے ہانہہ شاد رہاتھ اور نہ معلوم کیا کیا لگایا تھا لفٹ بھی تھا کتبخانہ بھی اُسی پیمانے کا تھا۔ کارل مارکس ژُنگ فرائیڈ سے تو شاید مشکل ہی سے واقف رہے ہونگے مگر مل اور ہربرٹ اسپنسر اور مسز اینی بیسینٹ۔ براڈ۔ بریڈلا کے ماہر تھے۔ یقیناً ہیولاک ایلیس سے بھی ناواقف نہ رہے ہونگے۔ تلک کا فلسفہ تو تھا ہی یہ کتبخانہ آج بھی الہ آباد یونیورسٹی میں موجود ہے لاوارث پڑے رہنے سے تو بہتر ہوا کہ بڑھتی بال سنگھ کی خیرات مرنے کے بعد بھی انکے ملک والوں کو فائدہ پہونچا رہی ہے۔ میرا ان کا ساتھ بیچ بیچ چھوٹ جاتا تھا مگر دل کے تعلقات میں فرق نہ آتا تھا مختلف زمانوں میں برسوں ملنے کی نوبت نہ ہوئی مگر جب ملے تو اسی صفائی سے ملے ہیں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں انکی پوری سوانحعمری نہیں ہے ایسی یاد احباب کی مثال اس طرح سمجھ لیجئے جیسے کوئی مصور ہو اور روٹیاں کمانے سے الگ خالی یا دپر اپنے بچپن کے یاروں کے اسکیچ بنانے کی کوشش کرے۔ کامیاب ہو یا نہ ہو مگر جو انداز ان لوگوں کے اس کے دماغ میں ہیں وہ تو نکال ہی لیگا۔ کسی دوسرے کو اچھی لگیں یا نہیں اس کے لیئے تو پرانی یاد تازہ ہو کر مزا دیجائے گی۔ بوڑھی ماں زندہ تھیں بیاہ کا

تقاضہ شروع ہوا مگر برتھی پال سنگھ اس رنگ پر نہ آتے تھے وجہ نہیں معلوم ہوتی تھی کہ شادی سے کیوں گھبراتے ہیں ہم لوگوں نے اکثر کہا مگر سواہنس کر ٹال جانے کے کوئی نتیجہ نہ نکلا اب ملک کی سیوا کی خواہش اور پولیٹیکل خیالات اور گہرے ہونے لگے لوگ مانیا ملک کا دور دورہ تھا۔ نہ معلوم کس سلسلے سے وہاں پہنچ گئے کچھ دن وہاں رہ کر کام کیا اس کے بعد واپس آگئے باوجود آزادی اور صاحب اختیار ہونے کے جاننے والوں کو دو باتوں کا پتہ چلتا تھا ایک تو یہ کہ ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ کام کچھ برہمچاری ہی خوب کرتا ہے۔ اگر شادی ہو گئی تو چلتی گاڑی میں روڑا اٹک جائے گا۔ دوسرے یہ بھی اندازہ ملتا تھا کہ ابھی تک یہ طے نہ کر سکے تھے کہ سیوا کا کون کام تجویز کریں جس پر اپنی پوری زندگی تج دیں۔ دفع الوقتی کے لئے غریب لوگوں کی تعلیم میں مدد کرنا بڑے اداروں کو چندہ دینا پولیٹیکل بٹے بازوں کے جعل فریب میں آجانا فی الحال یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ تعلیمی خیرات کے سلسلہ میں ایک غریب خاندان کی ایک لڑکی کو کمائیوں کے بہاڑ میں دیکھا اس کا وظیفہ مقرر کر کے کسی پاٹھ شالا وغیرہ میں بھیجا۔ یا میرے خیال میں اچھے آدمیوں کی پہچان میں سے یہ بڑی پہچان ہے کہ اس کو بچوں سے محبت ہو۔ پھر اگر بچہ خوبصورت ہوا تو اس کی طرف تو دل اور کھینچتا ہے اس لڑکی کو بھی دیکھ کر لوگوں کے دل میں ویسی کیفیت پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی کلی جھونگ پکڑ چکی ہو یا شمع روشن ہو۔ برتھی پال سنگھ جب گرمیوں میں نینی تال جاتے تھے تو یہ لڑکی

بھی چھٹیوں میں آتی تھی اور اس کے گھر والے سلام کے لیئے لے آتے تھے سال دو برس میں لڑکی کی شان ہی دوسری ہو گئی ؎

قدم قدم پر اٹھاتے ہو فتنۂ محشر ٭ یہ کمسنی کا ہے عالم شباب کیا ہوگا۔

کچھ دنوں میں یہ ہوا کہ دیکھنے والے درود بھیجنے لگے اور دن گذرے تو قرآن پڑھنے لگے "تبارک اللہ احسن الخالقین"۔ ایک ڈراما میں ایک ڈوئیل ہونے والی تھی میدان بدا گیا۔ جن صاحب نے لڑنے کا پیغام بھیجا تھا اُن کو اپنی بہادری کا بڑا دعویٰ تھا جب موقع پر پہونچے تو اپنے ساتھی سے کہنے لگے ارے یار اتنو بہادری کچھ کم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اے لو یہ تو بہت ہی کم ہو گئی۔ اس لڑکی کا اٹھان دیکھ کر پرتھی پال سنگھ کا برہمچاری پن بھی اُسی بہادر کی راہ جاتا دکھائی دیا۔ آخر کھیت رہے۔ پرتھی پال سنگھ گذر گئے انکی بی بی کی مٹی نہ بدا نے اپنی گود میں لے لی ہم خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں مگر پرانے تذکروں سے کچھ تازگی سی آ گئی ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ٭ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

جوانی کی منزل پار کر چکے بڑھاپے کا راستہ بھی کٹا چاہتا ہے مگر دل ابھی تک جوان ہے وہ ایک آفت میں جان ہے پیارے دوست کا قصہ پھر کہوں گا۔ لگے ہاتھوں دو چار شعر سُن لیجیئے ان کا ربط قصے سے ہو نہ ہو آپ جانیں میرے دل میں لہر اٹھی ہے میں لکھے جاتا ہوں آپ کا جی چاہے گا چھوڑ جائیگا۔

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب آئے اثر ٭ معلوم ہو گئے جو کبھی اُن نے نگاہ کی

نہ بیوفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا ٭ مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا
اے فغاں دیکھنا سمجھ لینا ٭ دیکھے دِل پھر لیا نہیں جاتا

سایۂ طوبیٰ و دلجوئی حور و لب حوض ٭ بہوائے سر کوئے تو بر فت از یادم
ز پادشاہ و گدا فارغم بحمد اللہ ٭ گدائے خاک در دوست پادشاہ من است
اڑائے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا ٭ ہمیں رکاب میں دو شوق لیتا جا
کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد ٭ بریدۂ ز ہمہ با خدا گرفتار است

اب زندگی ہی دوسری ہو گئی ملنا جلنا کم ہو گیا پولیٹکل دلچسپیاں ماند پڑ گئیں اگر کوئی ملتا ہے تو اسی طرح مل لیتے ہیں جیسے ہمیشہ ملتے تھے مگر دل کہیں اور رہتا ہے "میں تو پیا تورے رنگ ماں سمائی رہی" سے مطلب سمجھ جائیے۔ آدھا علاقہ رانی صاحبہ کے نام لکھ گیا باقی آدھا خرچ اخراجات کے لئے رہا اس آدھے کی مادھو لوٹ پڑ گئی۔ نہ معلوم کتنا قرضہ ہو گیا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ اولاد کوئی نہ ہوئی انکے سالے کی ایک پیاری پیاری لڑکی تھی اس کو اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ غالب سے کہا گیا تھا کہ جو شخص شراب پیتا ہے اس کی دعا قبول نہیں ہوتی انھوں نے جواب دیا کہ جب شراب مل گئی تو اب کون چیز رہی جس کے لئے دعا مانگی جائے یہی حال ہمارے دوست کا تھا نہ بی بختہ دلی سے دِل مضبوط ہو جایا پدری سے ضمیر کو آرام، وہ لڑکی آنکھوں کا نور چاہنے والی سے دل کا سرور زندگی کی چاشنی علم اور کتابوں سے دل کی طاقت دماغ کی روشنی گرمیوں میں مسوری جا کر دن

میں ہتھونداکی جنت بنا کے تھی اور سب پر اضافہ مزے کا حقہ لکھنؤ کا خمیرا لچھے دار دھواں خوشبو کی لپٹیں جو بابو بنکم چندر چٹرجی کو للچائیں ۔ عمر خیام کے خوابوں کی تعبیر اگر یہاں نہیں مل رہی تھی تو کہاں مل رہی ہو گی ۔ ظاہر ٹیم ٹام اور اوچھے پن سے نام پیدا کرنے سے انکو ہمیشہ کی نفرت مگر وہ بھی بن مانگے مل رہی تھی سر ولیم میرس کا زمانہ ایک راجہ سو رجیو یوں ہی کہلاتے تھے اب گورمنٹ نے بھی یہ خطاب بے مانگے انکے سر منڈھا انکو ذری سی خوشی نہ ہوئی مگر مفت کی لڑائی کون مول لے اسلئے چپ رہے ۔ برہتی پال سنگھ بلا وجہ انگریزوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے مگر انکو بھی دوسرے پڑھے لکھوں کی طرح انگریزی حکومت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی سر ولیم کے پہلے ایک مرتبہ بارہ بنکی میں لفٹننٹ گورنر آئے تھے ایک چھوٹی سی لیوی ہی برہتی پال سنگھ اس میں مجبوراً آئے مگر بالکل معمولی کپڑے پہن کر اس زمانے میں فلیٹ کیپ اور گھٹنوں تک کا بند گو کلارک لوگ عموماً پہنا کرتے تھے برہتی پال سنگھ بھی ہیڈ کلارک کے بھیس میں آئے تھے شام کو جب گارڈن پارٹی ہوئی تو یہ بڑی عمدہ انگریزی پوشاک پہنے تھے اس کو بعض انگریزوں نے بھی دیکھا دانت پیس کر رہ گئے تھوڑے دنوں کے بعد سر ولیم نے برہتی پال سنگھ کو لکھا کہ ہم تمکو وزارت میں لینا چاہتے ہیں انھوں نے کیا ! رانی صاحبہ نے رائے تو اسیوقت قائم کرلی تھی مگر دنیا کو قائل کرنے کے لئے دو چار احباب سے مشورہ بھی لے لیا نتیجہ تو پہلے ہی معلوم تھا ۔ انھوں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا ۔ خوشی کی پینگیں مزے کی

لہریں عیش کی راتیں آرام کے دن کبتک رہتے ہے

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط ۔۔۔ اے عمر ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

لیجئے صاحب ورق جو الٹتا ہے رانی صاحبہ چل بسیں اس کے بعد وہ لڑکی بھی بعد کو گذر گئی۔ پرتھی پال سنگھ تنہا رہ گئے۔ مذہب سے کبھی بے خبر نہ تھے اب سوا اس سہارے کے کون سہارا ایکڑیں۔ ممالک متوسط میں کھنڈوا بڑی جگہ سمجھا جاتا ہے۔ داداجی کا دربار ہندوستان کی بڑی جگھوں میں سے ہے پرتھی پال سنگھ کا عقیدہ بہت دنوں سے اُدھر مضبوط تھا۔ اب بالکل وہیں کے ہو گئے خاندان کے ایک لڑکے کو راس بٹھایا۔ اور خود کھنڈوا چلے گئے۔ کھنڈوا میں داداجی کے دربار جانے کو بہت جاتے ہوں مگر پرتھی پال سنگھ اس طرح گئے کہ پھر کسی چیز سے واسطہ ہی نہ رکھا جو نیا پایا رسے مسیح دنیا انھیں کو کرتے دیکھا روپیہ ضرور گھر سے جاتا تھا مگر اس کا انتظام ٹرسٹ کے ذریعہ سے پہلے ہی کر چکے تھے۔ جان جسم عقل رائے سب کچھ داداجی کا ہو گیا تھا ان کو جینے کا حکم تھا جیتے تھے جب مرنے کا حکم ملا اسی آن سے مر بھی گئے۔ نہ ولمیس نخوت نہ ہراس نہ خوشی نہ غم نہ دھڑکا نہ للک نفرت نہ رغبت۔ یورپ والا تو سمجھ نہیں سکتا تھا دنیادار ہندوستانی جو ان باتوں کو کچھ سمجھتا بھی ہے وہ بھی رضی برضا کا یہ درجہ دیکھکر مبہوت رہجاتا ہے کا عشق۔ یہاں والی بات جو شروع میں عرض کی گئی اب ایسی ایسی صورتوں میں ظاہر ہونے لگی کہ اگر ہمارے دوست کی جگہ ولمیس نہ ہو تو ناواقف دماغ کی خرابی سمجھے۔ میں خود کھنڈوا نہ پہنچ سکا لیکن

ہمارے دوسرے احباب جو وہاں گئے اور جن کے بیان میں شک کی گنجائش نہیں ہے اپنے چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں۔

اس مذہبی دربار کی خصوصیات میں سے ہے کہ داداجی مہاراج کے منھ سے دجد ان میں کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں کہ ظاہر ار لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتے ان باتوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس استھان کے فیضان میں حصہ رکھتے ہیں اور روحانیت کی روشنی حاصل کر چکے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اسی طرح کے ارشادات کی بنا پر پرتھی پال سنگھ نے کسی بہت چھوٹے آدمی کو بہت قیمتی ریشمی گاؤں بنوا دیا ہے کسی اُسی درجے کے آدمی کو موٹر کار خرید دی ہے جواہرات اور دولت سے وہ لوگ مالا مال ہو گئے۔ جو نہ علم رکھتے تھے اور نہ ہنر۔ اور جن کا برتاؤ پرتھی پال سنگھ کے مرنے کے بعد اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گیا۔ اتنا پڑھا لکھا آدمی اتنا سمجھ دار شخص اور اس طرح معمولی آدمیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو کر رہ جائے اگر آدمی زحمت نہ اُٹھانا چاہے تو یہ پورا معمہ ایک لفظ میں حل ہو سکتا ہے یعنی سٹری پن۔ ہاں اگر کوئی دماغ پر زور دے تو ممکن ہے کچھ معنی بھی نکل سکیں ویدانت اور تصوف میں پہلی شرطوں میں سے ہے کہ خودی نہ رہ جائے۔ اس درجہ پر پہونچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کھانا پینا روپیہ پیسہ ضروریات زندگی کی خواہش دور کر دی جائے مختصراً مایا کی محبت نہ رہ جائے۔ آدمی کھانا کھائے مگر صرف اس واسطے کہ اسکو حکم دیا گیا ہے کہ کھاؤ۔ پانی اسواسطے پیئے کہ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ پیو اسواسطے نہیں کہ اسکو خود اس میں کوئی لطف ہے۔ زندہ رہنے کا حکم ہے۔

زندگی کے لیئے یہ ضروری چیزیں ہیں اسلیئے یہ بھی سہی جب حکم ہوگا کہ مرجاؤ اسی انداز سے مر بھی جائیں گے ؎

بیٹھے نہیں زمیں پہ خزانے کو گاڑ کے ؎ موت آئی اٹھ کھڑے ہو دامن کو جھاڑ کے

اسی انداز سے مر بھی جائینگے جس انداز سے جیا کئے ہیں۔

خود اپنی خواہش اگر شریک ہوگئی تو سب محنت ملیا میٹ ہوگئی لکھنے والا دنیادار آدمی جب ان باتوں کو خود نہیں سمجھتا تو دوسرے کو کیا سمجھائے گا۔ مایا سے بے تعلقی اور وہی میر اسائٹ والا مزاج اگر اکٹھا کیا جائے تو شائد سمجھ میں آجائے۔

تھوڑا سا حال میرے دوست کا اور رہ گیا ہے۔ اس کو پڑھ لینے سے شاید وہ کچھ سمجھ میں آجائے جسکو بیان کرنے میں میرا قلم اور میری زبان دونوں ہار گئے کچھ دنوں کے بعد برہتی پال سنگھ بیمار پڑے لوگوں نے کہا دوا کیجئے انھوں نے جواب یا میں تو اپنی جان داداجی کو سپرد کر چکا اب مجھ سے اور دوا سے کیا واسطہ داداجی جانیں اور انکی مصلحت مجھ سے مطلب۔ نمونیا ہو گیا دق ہو گئی۔ برہتی پال سنگھ نے علاج کیسا فکر بھی نہ کی جب حالت بہت خراب ہوئی تو مہاراج نے خود فرمایا کہ اپنے گھر چلے جاؤ انھوں نے جواب دیا صرف داداجی کے چرنوں میں میرا گھر ہے اس در کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں۔ چیلے کی خاطر سے گرو خود ڈھونڈا آنے کو تیار رہتے۔ برہتی پال سنگھ ان کے قدموں سے لگے یہاں بھی چلے آئے مگر جیسے کوئی غیر آدے۔ میں نے سنا دل تڑپ گیا۔ فوراً ایک خط لیکر بھیجا کہ میری آرزو تھی کہ اپنے مرنے کے پہلے تم کو دیکھ لوں خدا کا کرنا ایسا کر تم

آ گئے ۔ اب جب کہو میں آؤں بڑھتی پال سنگھ حقے کے نیچے مجھ ہی سے منگوایا کرتے تھے میں نے یہ بھی لکھا کہ دو نیچے بنوا کر رکھ دیئے ہیں اگر تم نے حقہ چھوڑ نہ دیا ہو تو اپنے ساتھ لیتا آؤں گا ۔ اس کا جواب کسی اہلکار کے ہاتھ کا لکھا ہوا آیا کہ راجہ صاحب بہت بیمار ہیں کسی سے ملتے چلتے نہیں ۔ لیکن تم سے ملیں گے ۔ جب چاہو چلے آؤ ۔ میں دوڑا گیا دہی کوٹھی مگر باغ اجاڑ برساتی کے پیچھے برآمدے میں راجہ صاحب گے گروہ آرام کر رہے ہیں ۔ سیاہ فام دُبلے سے ایک آدمی ہیں داڑھی مونچھ صاف سبز تہمبر کا کرتا کسی اور رنگ کی ریشمی دھوتی ۔ ہاتھوں میں بے گھنڈیوں کے موٹے موٹے سونے کے کڑے پاس ہی ایک بڑے سے تسلے میں دھونی کا سامان ۔ ہال کے بیچ میں بھی دھوتی کی راکھ پڑی ہے ایک چھوٹے بغلی کمرے میں راجہ صاحب ہیں کیا دیکھتا ہوں کر بجائے تن و توش کے آدمی کے ایک منہنی سا چھوکرا جا تھنا کا چیتھڑا پڑا ہے ۔ جو نہ جانتا ہو وہ سمجھے کہ سات آٹھ برس کا کوئی بچہ بیمار ہے ۔ داہنی طرف دیوار پر دادا جی کی چھوٹی سی تصویر لگی ہے ۔ اور اسی کروٹ بڑھتی پال سنگھ پڑے ہیں سے

کل آپ عیادت کو جدھر بیٹھے تھے آکر
ابتک اُسی کروٹ سے یہ بیمار پڑا ہے

آدمی نے کہا مہاراج چودھری صاحب آئے ہیں ۔ بڑھتی پال سنگھ نے آنکھیں کھول دیں ۔ وہی مسکراہٹ وہی انداز صورت میں زمین آسمان کا فرق

ہو گیا تھا مگر پرتھی پال سنگھ وہی تھے۔

محمد علی اچھے ہو۔

ہاں اچھے ہیں۔

تم اچھے ہو۔

بالکل اچھے ہیں۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ باوجود ترک دنیا کے بچپن کا یار یار ہی ہے۔

پرتھی پال سنگھ۔ ہاں بچے اچھے ہیں گھر پر سب خیر عافیت۔

"ہاں بچے اچھے گھر پر سب خیریت! یہ تو پرتھی پال سنگھ واللااللہ اذنہ رہا یہ تو جیسے کوئی ظاہر وار بات کر رہا ہے،

میں (دل سے) ارے یہ کیا! (میرا دل) یہ سب باتیں صرف حلق سے تھیں دیکھتے نہیں ہو کہ اُن کی تو دوسری طرف لگی ہے۔

پرتھی پال سنگھ۔ لال جی کو بلاؤ (مجھ سے) لال جی کو دیکھ لو۔

نوکر۔ لالجی مہراج باہر گئے ہیں۔

میں۔ میں نے لالجی کو دیکھا ہے مگر اب اچھی طرح مل لونگا اس کے بعد پرتھی پال سنگھ کی آنکھیں نقاہت سے بند ہوگئیں ان چند لمحوں میں میرے برسوں برس کی آرزو پوری ہوگئی تھی اسلئے فوراً چلا آیا۔

باہر ٹھکر راجہ صاحب کے ماموں ٹھاکر جگموہن سنگھ کہنے لگے مجھ سے کہتے

تھے کہ میرے اندر بہت طاقت ہے۔ فقط دیکھنے میں کمزور معلوم ہوتا ہوں اتنے
میں لالجی بھی آگئے۔ یہ ایک منتی تھے مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہی نت وہی ہنسی کا انداز
وہی جسم کی تھلتھلاہٹ وہی۔ برہتی پال سنگھ پھر چھوٹے ہو گئے۔ میرے کان
میں جیسے کسی اپسرا کسی گندھار و نے کہا۔ ارے کہیں یہ تصویر بھی تو برہتی پال سنگھ
کے ساتھ مٹنے والی نہیں ہے پتھونڈا اور لکھنؤ کے درمیان میں بارہ بنکی پڑتا ہے
جو ہمارے ضلع کا صدر مقام ہے۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر میرے ملاقاتی تھے میں
وہاں ٹھہر گیا رات کو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کی آواز سنی کہہ رہے ہیں کہ
چودھری صاحب سے کہہ دینا کہ راجہ صاحب سورجپور کی طبیعت بہت خراب
گئی ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں صبح کو چائے پر انتظار نہ کریں۔ کوئی نو بجے کے
قریب وہ لوٹے۔

میں۔ کہیے کیا حال ہے۔

وہ۔ افاقتہ الموت معلوم ہوتا ہے۔ جب میں پہونچا تو وہ سنبھل گئے تھے۔
صاحب وہ تو معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ تو کوئی بڑا رسیدہ آدمی معلوم
ہوتا ہے۔ بڑے اطمینان سے اس نے باتیں کیں۔ میں نے کہا راجہ صاحب
خدا آپ کو اچھا کردے مگر احتیاط سب کا فرض ہے۔ اگر کچھ روپیہ وغیرہ
بج کی تحویل میں ہو تو ریاست کے خزانے میں داخل کروا دیجئے یہ بھی
آپ کا وہ بھی آپ کا راجہ صاحب نے کہا اچھا داخل کروا دیجئے۔

میں نے کہا جواہرات وغیرہ بھی ہوں تو وہ بھی داخل کروا دیجئے۔
راجہ صاحب۔ جواہرات وغیرہ تو کچھ رہے نہیں پچپن ہزار کے زیورات
تھے وہ میں نے اپنی بی بی کی لاش کو پہنا کر نربدا میں بہا دیا تھا اب کچھ نہیں
ہے۔ دوسرے دن راجہ برھتی پال سنگھ ختم ہو گئے انکی لاش بھی ان کی
وصیت کے موافق نربدا کو لے جائی گئی تھوڑے دنوں میں وہ متبنیٰ لڑکا
بھی ختم ہو گیا۔ ؎

ہمسا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

یادِ احباب

دیو جانسن یا انی فورس؟

تقریباً سنہ ۱۸۸۰ء میں تعلقداران اودھ کا ایک البم نکلا تھا۔ اس میں ایک آٹھ نو برس کے لڑکے کی بھی تصویر تھی۔ اُس مجمع کا یہ آخری بڈھا تھا جنے تقریباً آٹھ نو برس ہوئے انتقال کیا۔ اب وہ محفل پوری کفن پوش ہو چکی اُن کا نام درگاہی خاں تھا۔ اُونچ گاؤں اُن کے تعلقہ کا نام تھا اور مسلمان ٹھاکر تھے۔ میں اُن کا نام دیکھنے کے بہت پہلے سے سُنتا تھا۔ مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے مگر ایک زمانہ ایسا تھا کہ ہمارے اور اُنکے دونوں کے علاقے کورٹ آف وارڈس میں تھے۔ نہایت کم سنی میں میرے کورٹ کی شروع تھی اور اُن کے نابالغی کے زمانہ کا صرف دُم چھلا باقی تھا۔ اسی وجہ سے اُن کا نام اکثر سنتا تھا۔ جب ہوش سنبھالا تو اُن کے واقعات زیادہ دلچسپی سے سُننے لگا۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ ملاقات ہوئی۔ تھوڑے بہت مراسم بھی ہو گئے۔ لیکن ہمارے اُن کے گھروں کے درمیان میں جنگل دریا۔ پگڈنڈیاں۔ نالے۔ کھوئے۔ اوسل۔ بنجر۔ کھادڑ خاک دھول بلا اتنے حائل تھے کہ ملنے کا اتفاق کم ہوتا تھا۔ لیکن اُنکی طبیعت اس طرح کی

واقع ہوئی تھی کہ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی دیکھ لیتا تو عمر بھر نہ بھولتا۔ پڑھے لکھے کم تھے۔ وضع قطع بالکل ہندو کی۔ بڑی سی چرٹی بھی تھی جس کو کہتے تھے کہ پچھو چھے شریف کی منت کی ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ جس قدر علم تھا بھی اُس کو نہایت احتیاط سے چھپاتے تھے۔ بچپن میں کچھ انگریزی بھی پڑھی تھی مگر کیا مجال جو کوئی اُس کا پتہ پا جائے۔ بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ پڑھایا گیا تھا وہ بھول گئے تھے۔ اکثروں کا خیال تھا کہ درگاہی خاں اُن لوگوں میں نہ تھے جو کوئی چیز بھی بھول جائیں۔ اُن کی زبان بالکل جاہل دیہاتیوں کی تھی تھی۔ ق کی چھاؤں بھی نہ تھی مگر مطالب بار کس۔ ارلیبس سقراط۔ جرمی بنتھیم حافظ شیرازی۔ برٹرنڈ رسل کے ہوتے تھے۔ انداز گفتگو میں ڈاکٹر جانسن کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اور پھر دیکھئے تو خالص جاہل دیہاتی بانگڑو۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی پہنانے والا۔ بہت دور کی کوڑی لانے والا۔ عقل سلیم کا لطف اُٹھنے والا جنگلی۔ ہوش۔ اَن پڑھ۔ بڑا کوا اور کندۂ ناتراش۔ غرضکہ ہمارے دوست تمام تضاد باتوں کا مجموعہ تھے حضرات ناظرین۔ بابو درگاہی خاں کی قلمی تصویر نہ میں کھینچ سکتا ہوں نہ آپ اس کو سمجھ سکتے ہیں مگر مثالوں سے شائد کچھ اندازہ ہو جائے۔ ایک دن کسی نے پوچھا۔ بابو صاحب آپ کے کئے صاحبزادے ہیں۔ بولے چار ہیں۔ مرے جئے سسر دوئی جانو۔ اسی طرح کسی نے خبر سُنائی کہ فلاں تعلقدار کا علاقہ کورٹ آف وارڈس سے چھوٹ گیا۔ بولے

بھیا... کا علاقہ چھوٹ گوا" تو اب مہرون کی پھلواری لاگ ہوئی ہے۔ یعنی اب عورتوں
کا باغ لہلہا رہا ہوگا۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں ملاقات ہوئی بڑے
تپاک سے ملے۔ میں نے خوش دلی اور خلوص سے کہا۔ بابو صاحب ہم آپ کے
یہاں آئینگے۔ کہنے لگے "کون بوا ہے اَیہو" یعنی تم کو کیا حق ہے آنیکا کس بنا پر تم
آؤگے۔ میں نے جواب دیا۔ خیر میں آؤں گا ضرور۔ آپ کا دل چاہے تو نکلوا دیجئے
فرمانے لگے نہیں اَیہو تو بکرلیہو سیس کاٹہ ہے۔ مل بے بلائے کوئی کے یہاں کا جاب
ٹھیک نہیں۔ یعنی آئیے گے تو بکرا حلال ہی کرنا پڑے گا۔ مگر بغیر بلائے کسی کے
یہاں جانا اچھی بات نہیں ہے۔ درگاہی خاں صاحب بڑے منتظم تعلقداروں
میں تھے۔ ایک دن میں نے اُن سے ترکیب پوچھی کہ اخراجات کیونکر کم کئے
جائیں۔ کہنے لگے کہ یہ میز۔ کرسی۔ کوچ۔ سوفا جس مکان میں رکھے ہو اُس
کو بند کردو اور اُس حصّہ مکان کی طرف اشارہ کرکے جو قدیم وضع کا دیوان
خانہ کہلاتا ہے۔ وہاں چارپائی بچھا کر بیٹھو۔ اگر مہاراجہ محمود آباد بھی آدیں
تو وہیں بٹھاؤ۔ سرہانے سے سرک کر تم خود پائتی جا بیٹھو۔ اور معزز مہمان کو
سرہانے جگہ دو۔ خرچ ابھی کم ہوجائے۔ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ
جب اُن کا علاقہ واگذار ہوا تو ناچ اور رنگ تھا۔ عیش اور جوانی کی اُمنگ
تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک مچھلی کا بیاہ بھی رچایا تھا۔ مچھلی کا بیاہ کیونکر ہوا
تھا یہ نہیں معلوم۔ پچاسوں رنڈیاں۔ ڈیرہ دار موجود تھیں بڑے زور کا مجرا

ہو رہا تھا۔ اتنے میں مسند کے پیچھے ایک پشاوری سوداگر آکر کھڑا ہوا اور بھری محفل میں کہنے لگا۔ بابو صاحب ہمارا روپیہ کب دو گے تھیٹر میں جیسے جادوگر کے آتے ہی پردہ پھٹتا ہے اور سین بدل جاتا ہے اسی طرح بابو صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہم کہا کہ جب ایسے میں مہاجن اپنا کرجہ مانگ بیٹھا تو ای گانے ماکون مجا رہگوا۔ (میں نے کہا کہ جب قرضخواہ بھری محفل میں اپنا قرضہ مانگ بیٹھا تو عیش کہاں باقی رہا) محفل برخاست۔ رنڈی بھڑوے۔ جوالی۔ موالی۔ تماشائی۔ طفیلیئے رخصت۔ مصاحب خوشامدی۔ نیمبو نچوڑ۔ مہتمم ناظرات میراثی۔ بھانڈ بھگتیئے سب یکقلم برطرف۔ رات توجوں توں کٹی۔ صبح سے دوسرا رنگ دوسرا ڈھنگ دوسرا سامان۔ خیمے شامیانے غائب۔ فرش دفروش جہاں کے تہاں پہونچے۔ خاکی چوپال کے چھپر میں بابو صاحب کھٹیا (یعنی چارپائی) پر بیٹھے۔ سیر کا غلہ تلوا تلوا کر دیہاتیوں کو ڈیڑھی سوائی پر بانٹ رہے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ریوولیوشن ختم ہوا۔ قرضہ۔ بدانتظامی قصہ پارینہ ہو گیا۔ ایوولیوشن کا وقت آیا۔ علاقے بھر میں جتنے پیشہ در مثلاً تیلی۔ موچی۔ جلاہے ہیں سب بابو صاحب کے قرضدار۔ جتنے کاشتکار دعایا ہیں سب ڈیڑھی سوائی کا بیوہار۔ خود ہی زمیندار خود ہی ساہو کار۔ دل کی کھڑکی بند ہو گئی۔ دماغ کا دروازہ کھل گیا۔ رعایا برایا اگر خوش

نہیں تو مطمئن ضرور ہو گئے۔ بابو صاحب نے ابیقورس کا فلسفہ چھوڑ کر دیو جانس کا اختیار کیا۔ گاندھی کے کھدر کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا اس وقت بابو درگاہی خاں گاڑھا زیب تن کئے اور اس پر کچھ رنگ ملامتی فقرا کا اضافہ کئے نظر آتے ہیں۔ مقامی صنعت و حرفت کی مدد کا خیال صرف کتابوں میں رہا ہوگا اس وقت بابو صاحب اپنے علاقہ کے چماروں کا بنایا ہوا جوتا پہنے لگے تھے۔ اسی کے ساتھ امارت کی بھی شان باقی تھی۔ گاڑھے کے کرتے میں بڑے بڑے سونے کے بٹن جو شاہ دھینی سے کاٹے گئے تھے لگے ہیں تین آنے کے نریل حقے میں دس تولے کا دست پنا سونے کا لٹکایا گیا ہے۔ مگر اس میں بجائے زنجیر کے سُتلی بندھی ہوئی ہے۔ اسی طرح بٹنوں میں بھی سوت کی ڈوری کرتے کے نیچے بندھی تھی۔ ضلع اور صوبہ کے دربار کے لئے ایک پوشاک مع ایک کامدار ٹوپی کے رکھتے تھے۔ مگر اس انداز سے پہنتے تھے کہ جس سے کپڑے کی شان اور دربار کا ڈھونگ دونوں کی ٹھیک نکل جائے۔ ان کے ضلع کے ڈپٹی کمشنر مجھ سے کہتے تھے کہ جب درگاہی خاں ملنے آتے ہیں تو ہمارے دفتر کے سامنے وہ جو آبنہ کا پیڑ ہے اس کے نیچے درباری کپڑے زیب تن کر کے اطلاع کروا دیتے ہیں۔ لکھنؤ سے بابو صاحب کا مکان تقریباً ساٹھ میل ہو گا۔ یہ لکھنؤ کے دربار وغیرہ میں ہمیشہ جھگڑے پر جاتے۔ گھر سے جنس اور اناج حسن ساتھ لے جاتے تھے اور سوا پانی کے لکھنؤ کی کسی چیز کے شرمندہ

نہ ہوتے تھے۔ سپاہی۔ باورچی۔ سب ساتھ ہوتے تھے۔ غربت میں وطن کا لطف اُٹھاتے تھے۔ آخر زمانہ میں کبھی کبھی ایک ایکہ بھی ہمراہی میں ہوتا تھا جس کو خود ہانکتے تھے۔ میں نے اُن کو مجھلی کے بیاہ کے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اُن کی بات میں استہزاء اور سماج سے نہ ڈرنے کا پہلو ایسا نکلتا تھا کہ جس سے شک ہوتا تھا کہ طبیعت کا رنگ جب سے بدلا تب ہی سے سینک ہو گئے تھے۔ عموماً اودھ کے دیہاتی زمینداروں کا یہ حال ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے خود اپنی رعایا پر سختی کر لیں لیکن دوسرے کے مقابلہ میں اپنے اسامی کے لئے جان ہی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بابو صاحب نہ اسی رنگ میں تھے نہ اُسی رنگ میں مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ اضافہ بھی نہ کرتے تھے۔ بندوبست کے بعد جس قدر مالگزاری بڑھی اُسی حساب سے اُنھوں نے آنکھیں بند کر کے اضافہ کر لیا۔ پھر اس کے بعد ہفت سالہ یا ہید خلی اور نت نیا انتظام جس میں لگان بڑھایا جائے اُن کے یہاں نہیں ہوتا تھا۔ سنہ ۲۱ عیسوی کے نان کو آپریشن اور کسان سبھا کے زمانہ میں ایک دن وہ میرے یہاں آ بیٹھے تھے کہ چند کانگریس کے لوگ آ گئے اور مختلف علاقہ جات میں جو شورشیں ہو رہی تھیں اُن کا ذکر کرنے لگے۔ بابو صاحب نے کہا کہ اگر آپ لوگ ہمارے علاقہ میں بدامنی پھیلا دیں تو ہم سو روپیہ آپ کو مٹھائی کھانے کو دیں۔ اردگرد کے علاقوں میں آفتیں مچی تھیں مگر جہاں تک سنا گیا اُن کے

یہاں ہر طرح سے امن ہی رہا۔ اس کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں اور میرے خیال میں وہ سب تھے۔ نذرانہ وغیرہ نہ لینا۔ ہر شخص کو فرصت کر قابو میں رکھنا۔ ڈیڑھی سوائی کی وجہ سے رعایا کا ٹوٹا ہونا۔ پکی سڑک اور ریل سے دور ہونا۔ اور بیجا ظلم اور تشدد نہ کرنا۔ اضافے اور نذرانہ والا فائدہ ڈیڑھی سوائی سے نکال لینا۔ اُن کے ضلعے میں زراعتی نمائش تھی۔ رؤسا اور تعلقداروں نے بڑے بڑے سامان کئے ہر شخص نے نمائش کے میدان میں اپنے کیمپ قائم کئے۔ سپاہیوں کی وردیاں بنیں تلواروں کے قبضوں پر چاندی کا پانی پھرا۔ کاٹھیوں پر مخمل پھر سے چڑھایا گیا قصہ مختصر ہر شخص نے علیٰ قدر حیثیت خوب شان دکھائی۔ بابو صاحب نے وہی ٹھاٹھ رہے جو ہمیشہ سے تھے۔ وہی چھکڑا وہی گھر سے اناج وغیرہ ساتھ آنا۔ نہ رتھ نہ بہلی۔ نہ بیلوں کی نئی جھول نہ چاندی کی سینگوٹیاں۔ البتہ اُن کی گوئی نے ضلعے بھر میں اول انعام پایا۔ دروازہ پر ایک شاندار مگر نہایت بیوقوف بینڈھا بندھا رہتا تھا۔ اُس غریب کو خبر بھی نہ ہوئی اور بابو صاحب نے اُس کا بھی اول انعام اپنے ڈب میں کیا۔ خود فخریہ حساب بتانے لگے کہ اور لوگوں نے اپنی آمدنی کا معتد یہ حصہ خرچ کیا۔ اور ہم بجائے خرچ کرنے کے کچھ کما ہی لائے ہے۔ نمائش کے سلسلہ میں راجہ صاحب مرحوم حسن پور نے سب تعلقداروں کی دعوت کی تھی جسمیں بابو صاحب بھی تھے

بھی تھے سب سے پہلے اُن کی نظر زعفر پر پڑی اور ذرا سا جھک کر طشتری
دستر خوان پر سے اُٹھا کر اپنے پہلو میں رکھ لی۔ میزبان نے اسکی وجہ پوچھی
بابو صاحب۔ ناہیں اب نہ کھیبا۔ اِی کا جگنو کے کھاتر ہے جیبا (نہیں
اب نہ کھائیں گے۔ اس کو جگنو کے واسطے لے جائیں گے)
میزبان۔ یہ جگنو کون ہیں۔
بابو صاحب۔ جگنو ہمری مہر دا آئین (جگنو ہماری بی بی ہیں)
میزبان۔ یہ خطاب اُن کو آپکے یہاں دیا گیا ہے یا پہلے ہی سے اُن کا یہ نام تھا۔
بابو صاحب ناہیں جب آئی رہے تو اس لوگ جب دیا کی ٹیون۔ تو ہم کہا جگنو آئے
(نہیں جب بیاہ کے آئی تھی تو ایسی چمکتی تھی جیسے شمع کی لو۔ تو ہم نے
کہا تھا یہ جگنو ہے)
پڑھنے والوں نے یہ الفاظ تو دیکھ لیئے مگر جگنو کہتے وقت درگاہی خاں
کا چہرہ کہاں دیکھا آپ اگر کسی رنگ دار سے عمدہ چٹنی بنوائیے اور کسی
کو کھلا کر اس کا چہرہ غور سے ملاحظہ کیجیئے تو شائد بابو درگاہی خاں کے چہرہ
کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ پچھلی کے بیاہ کے زمانہ کی رنگینی آج بھی باقی تھی مگر
ڈھنگ دوسرا تھا۔ تب دنیا بھر کی آنکھ بھیڑیں۔ بن تیریاں۔ چمر بگلیاں
بھری رہتی تھیں۔ اب بجائے اُن کے لمبے گھونگھٹ والی دیہاتنیں۔ الھڑ
نادان بے سمجھ مگر فطرت کی دولت سے مالا مال نیچ قوم کی عورتیں تھیں۔

جو اکثر سیر اور کاشتکاری کے سلسلہ میں گھر پر کام کرنے آتی تھیں خود فرمایا کرتے تھے کہ ایمان ایک اور وبات ہے، (یعنی اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے) پھر اناج چوری جائے کا ڈر نہیں رہجات ہے۔ (پھر اناج وغیرہ کی چوری کا ڈر نہیں رہ جاتا) او سسری پھر اپنے مال جانئے لگت ہیں۔ (یعنی ان تعلقات کے بعد پھر وہ بیوقوف لوگ اپنا مال سمجھنے لگتی ہیں اور بجائے چوری کے اُسکی حفاظت کرتی ہیں۔) اسکے بعد بے تکلفی میں بابو صاحب نے صنف نازک کے بارے میں کچھ میرے تجربات دریافت کرنا چاہے مگر میں نے یہ کہہ کر سلسلۂ کلام جاری رکھا کہ وسطحیات میں پہونچ کر ہمسن دل نہیں گرماتی اور کم سن سے شرم آتی ہے۔ کہنے لگے ڈر ادانہ کرو۔ روپیہ پیسہ مٹھائی کٹھائی سب کمی پوری کر دیتی ہے۔ معاملہ کے بہت صاف تھے۔ اور زبان سے جو کہہ دیتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا۔ اسی ذیل میں ووٹ دینا بھی تھا مگر ایک بات اور کرتے تھے یعنی مبلغ ۵۰۰ کرایہ کے نام سے لے لیتے تھے۔ پھر کوئی ہزار روپیہ بھی دے مگر در گاہی خاں یہی کہتے تھے کہ ہم تو بکائے گیئن (یعنی اب ہم بک گئے اب کچھ نہیں ہو سکتا) اس معاملے میں اُن کی دور بینی اور دور اندیشی کا قائل ہو جانا پڑتا ہے یوں دیکھنے میں بڑی ذلیل سی بات ہے مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ

اُن سے زیادہ دولت مند اُن سے زیادہ پڑھے لکھے بات کُھلم کُھلا کرتے ہیں اور پھر کوئی تعداد بھی نہیں جس قدر مل جائے شیر مادر تو صرف مرحوم کا گناہ ہلکا ہی نہیں ہو جاتا بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے پھر انھوں نے برسوں پہلے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جو دوسروں کو نہ دکھائی دیا تھا۔ یہ کو انھوں نے رقم دوگنی کر دی تھی میں نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے کہ فلاں راجہ کے انتخاب میں گئے تھے۔ بڑی خاطر بڑی مدارات ہر وقت مزاج پرسی کیلئے ذی عزت ملازمین موجود۔ خدمت کے لئے نوکروں کی کمی نہیں۔ سواری بھی حاضر لیکن ووٹ گذرنے کے بعد کوئی بات نہیں پوچھتا۔ ہم لاوارث لڑکے کی طرح ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اتنے میں راجہ صاحب نے دیکھ لیا۔ راجہ صاحب اُرے بابو صاحب آپ کو سواری نہیں ملی۔ کوئی ہے لاؤ موٹر کار آپ کے لئے۔ اس کے بعد نائب صاحب آئے۔ اُرے بابو صاحب آپ کو بڑی تکلیف ہوتی۔ ارے میاں سواری منگواؤ بابو صاحب کے لئے معاف کیجیگا۔ موٹر سب سواری میں گئے ہیں۔ جوڑی حاضر ہے۔ اسی پر چلے جایئے تھوڑی دیر کے بعد مختار صاحب آئے بابو صاحب ارے ابھی تک آپ کے لئے سواری نہیں آئی۔ دیکھئے میں ابھی منگواتا ہوں البتہ آپ کو تکلیف تو ہو گی اس وقت سواریوں کا ایسا توڑا ہو گیا ہے کہ کیا کہوں۔ تانگہ منگواتا ہوں۔ سپاہی سے

جاؤ ایک اچھا سا تانگہ لاؤ۔ دیکھ لینا ذرا صاف صوف ہو۔ ابھی آتا ہے تانگہ۔ یہ کہہ کر وہ بھی تشریف لے گئے۔ کیسی کار کیسی جوڑی۔ کیسا تانگہ جوتیاں چٹخاتے ڈیرے پر پہونچے "تب سے ایک سو دس روپیہ کر دین"۔ اسی طرح کے ایک انتخاب کے سلسلہ میں مجھ کو بھی ایک دوست کی سفارش میں ایک خط بابو صاحب کو لکھنا پڑا۔ جواب آیا کہ مجھ کو آپ کے کہنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن ایک سو دس امرود اپنے باغیچہ سے بھجوا دیجیئے۔ چنانچہ میرے دوست کے کارکن صاحب ایکسو دس امرود رائج الوقت چہرہ دار لیکر گئے۔ اس خاص معاملت پر پسندیدگی کی مُہر لگانے کی غرض سے دو عدد بیڑے مختار کو عنایت ہوئے جن کا رنگ امتداد زمانہ سے بدل کر سفید کا سبز ہو گیا تھا۔ مختار نے وہاں سے واپسی پر مجھ کو دکھائے۔ اور اس کے بعد اپنے آقا کو دکھانے کے لئے لیتے گئے۔

روٹ حاصل کرنے میں جو خوشامدیں چاپلوسیاں اور ابلہ فریبیاں کرنی پڑتی ہے معلوم ہیں۔ جو دھوکے اٹھانے پڑتے ہیں وہ بھی ظاہر ہیں چنانچہ آزمودہ کار مختار نے غور کرنا شروع کیا کہ مکان فرنیچر باغ۔ سواریاں۔ کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں کہ جن کی تعریف کرکے میزبان کو خوش کیا جائے۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو کہنے لگے کہ بابو صاحب آپ کے مکان کے سامنے میدان بڑا عمدہ ہے جس میں تازہ ہوا

کا فائدہ کھُلا کھُلا ہے۔ وہاں ایسے واقعہ پرست سے سابقہ ہوا تھا جو خوشامد کی لغویت اُسی وقت کھول دیتا تھا۔ لہٰذا بابو صاحب نے ایک غلط انداز "ہوں" بلکہ "ہو ...." میں تصنع اور دُنیا سازی کا بھانڈا پھوڑ دیا مختار نے دوسرا حملہ کیا مختار "۔ بابو آپ کے دروازے مسجد بڑے موقع سے ہے۔ مگر اس کی چھت بھی پٹوا دی جائے۔ ابکی بابو صاحب مقابلہ پر تیار ہو گئے۔ "سُنو مکھتیار صاحب۔ اِن کا جو بہت منھ لگا وا اُو کا تبا ہے دیکھا۔ بس اتنے بہت ہے۔ قائم ہو گئے گو اکہ ہم اُن کا مانت ہن۔ اور کا چہیئے؟ او کچھ ہمری نماج کے بھوکے ہیں کہ اُن کا رہے کا گھر چہیئے۔ اس جگہ مجھ کو غالب کا ایک شعر یاد آگیا۔

بزم ترا شمع و گل خستگیٔ بو تراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

بابو درگاہی خاں انکسار و خاکساری کی تصویر تھے۔ اُن کے ملازمین اکثر اُن سے صاف ستھرے رہتے تھے۔ ایک دن اُن کے ساتھ ایک اہل قلم ملازم تھے جن کو میں سمجھا کہ اُن کے کوئی عزیز ہوں گے۔ میں نے دریافت کیا۔

بابو صاحب "۔ ناہیں اجے نہ آئیں لالہ ہوئیں ہمرے یہاں کام کرت ہیں (دبی زبان سے) ریل پر سب کو وُہ ہمیں کا دھکیاوت ہیں۔ اِن کلکتہ

دیت ہیں (صاف گو بڑدیں کی طرف اشارہ کر کے) (ریل پر سب لوگ ہم ہی کو دھکا دیتے ہیں اور ان کے لئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں) ایک مرتبہ تو انھوں نے غضب ہی کیا۔ میرے یہاں آئے معلوم ہوا کہ میں ایک دوست کے یہاں ہوں۔ وہ بھی وہاں پہونچے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بیچوں بیچ پیٹھ پر کوئی چھ انچ مربع سُرخ چھینٹ کا پیوند لگا ہوا ہے۔ وایسی میں مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا کہ دوسروں کی رائے سے بے پروائی کی ایک انتہا ہوتی ہے بابو صاحب نے احتراض کا جواب اور معذرت سب دو لفظوں میں کی۔ مسکراہٹ کے ساتھ آنکھ مار کر۔ "مہروَن کے لہنگا کا ہوئے" (یہ پیوند عورتوں کے لہنگے کا لگایا ہے) ایک پہلو اُن کی شخصیت کا اور سُن لیجئے۔ اگر موقع آن پڑے تو بابو درگا ہی خاں دبنگ بھی تھے پہلی جنگ میں ضلع کے پارسی ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے کسی بات پر مزاج برہم تھا۔ ڈپٹی کمشنر "بابو صاحب آپ نے جنگ میں کتنا چندہ دیا ہے۔ بابو صاحب "ہم کچھو نا ہیں دیا ہے۔ ہم سُنا کہ جرمن آوت ہیں اور چھین لے ہیں تو ن ہم قرضہ بانٹ دیا۔ ڈپٹی کمشنر "یہ کیسی بات ہے۔ آپ نے اپنی سند پڑھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ سرکار تم کو یہ علاقہ عطا کرتی ہے۔ جب سرکار کو ضرورت ہو تو اس کی مدد کرو۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرکار آپ کا علاقہ واپس لے سکتی ہے۔ بابو صاحب "ہاں صاحب، ای ہم کا نا ہیں معلوم رہے (یہ کہئے ہم کو

نہیں معلوم تھا) اچھا کیو صاحب بتائیے دیو را چھا کیا آپ نے بتا دیا)
اب ہم اُو کے پاس نہ جاب (اب ہم اُس کے پاس نہ جائیں گے) ہاں صاحب ائی چیج
کے پاس جائی مارے جائی ہاں صاحب دوسرے کی چیز کے پاس جائیں مارے جائیں)
ڈپٹی کمشنر۔ نہیں نہیں یہ مطلب نہیں۔ آپ کا علاقہ آپ کے پاس رہیگا
لیکن آپ کو سرکار کی مدد کرنا چاہیئے۔

بابو۔ ناہیں صاحب الا کا ہمرا ہو ئیبے نہ کرے تو رہیئے کیسے ہمرے پاس
آب صاحب تم جانو الا کا جانے "۔

(نہیں صاحب جب علاقہ ہمارا ہئی نہیں تو رہیگا کیسے ہمارے پاس۔
اب آپ جانیئے اور علاقہ جانے)

مالگجاری و الگجاری اب ہم سے نہ مانگیو صاحب۔ اپنا وصول
کر لیو۔ ہم پرائی چیج کے پاس کیسے جان۔ (مالگزاری و الگزاری اب
آپ ہم سے نہ مانگیگا۔ خود وصول کر لیجیگا۔ ہم دوسرے کے مال
کے پاس کیسے جائیں)

ڈپٹی کمشنر۔ نہیں نہیں۔

بابو صاحب۔ ناہیں ناہیں اب ہم سے کوؤ مطلب نہیں۔

ڈپٹی کمشنر نہایت پریشان کہ ذرا سی بات کے لیئے کیا لوکل گورنمنٹ
کو لکھا جائے اور کیا گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا جائے۔ سیٹلمنٹ تعلقدار علاقہ

سے کیوں وسعت بردار ہو رہا ہے۔ کیا سختی کی گئی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے۔ خیر اس وقت تو بابو ہی صاحب کی جیت رہی مگر بعد کو قرضہ جنگ دینا ہی پڑا۔

اسی طرح ایک سینیر ڈپٹی کلکٹر سے میں نے ملایا اور کہا کہ آپ کے ضلع میں یہ ڈپٹی کمشنر ہو کر آنے والے ہیں۔

بابو صاحب۔" ہاں کاہے نا ہیں۔ بہت آئے بہت چلے گئے۔

یہ دونوں واقعات ہندوستانیوں کے ساتھ ہوئے۔ نہ معلوم انگریز کے ساتھ بھی بابو صاحب یہی برتاؤ کرتے تھے یا نہیں۔ اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ بابو صاحب ایک صاحب کے یہاں گئے۔ وہاں دوسرے کمرے میں ایک بہت بڑے شخص بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ بابو صاحب کی دیہاتی باتوں سے لطف اٹھائیں۔ انکے ایک مصاحب نے بابو صاحب کو وہاں بلانا چاہا۔ بابو صاحب نے کہا" کا کری ہُواں آئے کے ہم ڈونگیا اُو ئی جہاج۔ تنی سے دھکا لاگے ڈوب جائی"۔ (کیا کریں ہم وہاں آکر ہم ذرا سی ناؤ ہیں اور وہ جہاز ذرا سے دھکا لگے گا تو ہم ڈوب جائیں گے۔)

ایک مرتبہ ایک دعوت کا رقعہ موصول ہوا جس میں بجائے بسم اللہ کے خود لکھا تھا رقعہ تین دن یا تین وقتوں کی مسلسل دعوت کا تھا مگر

جو چیز مجھ کو پسند آئی وہ تمہ تھا باضابطہ خط المکلف پر ختم تھا۔ اُس کے بعد یگانگی کی حسب ذیل دو سطریں تھیں مگر بہ آنکہ اگر آپ نہ آئے گا۔ تو مجھ کو شکایت نہ ہوگی۔ ہنسنے کو ہنس لیجئے مگر اسی جملہ پر مجھکو اپنے ایک دوست کا رقعہ یاد آگیا جو انھوں نے ایک ایسے ہی موقع پر لکھا تھا۔ بھائی محمد علی تم بہت دور پہاڑ پر ہو میں جانتا ہوں کہ تم کو آنے میں بہت زحمتیں ہیں۔ یہ رقعہ صرف اس واسطے بھیجتا ہوں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ ایسی خوشی کے موقعہ پر میں تم کو بھول گیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ملاقات کے وقت میں نے تمہ کا مطلب پوچھا۔

بابو صاحب۔ ایک دن کھدا ئے کے نام کی دعوت۔ ایک دن محمد کے نام کی اور ایک دن دنیا کے نام کی۔"

ایک طرف تو یہ حال تھا دوسری طرف پردے کو بالکل لغو جانتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی قریب بیاہی لڑکی کو لڑکوں کی طرح دھوتی کرتا اور ٹوپی پہناتے تھے۔ جب میں نے دیکھا تو بال بھی نہ تھے۔ البتہ ایک انگوچھا گردن پر ڈالے رہتی تھی۔ چونکہ وہ سینے تک نہیں پہونچتا تھا اس لئے شرم کی وجہ سے اسکے سرے دونوں ہاتھوں سے اکثر پکڑ لیتی تھی۔ اب ماشاء اللہ بیاہی بال بچوں والی ہے اس وقت بچہ ہی تھی مگر اس کی ۱۲ یا ۱۳ برس کی

بندوق الگ تھی۔ میں نے اُسی وقت کہا تھا کہ اگر اس لڑکی کو ہسٹریا کی بیماری ہو جائے تو جو جرمانہ کہو میں دوں۔

اُستاد

"جیسے آیا تھا کسی مُلک سے ایک ہنس بیچارہ" اسی طرح کوئی پندرہ

سولہ برس ہوئے ایک بڑے میاں ۶۰-۶۵ برس کا سن ہمارے قصبہ میں آئے اُن کے ساتھ اُن کی اہلیہ انھیں کے سن وسال کی اور کچھ میلا میلا اسباب قوم کے جلاہے تھے۔ نہ معلوم کس طرح جان پہچان کی اور ایک اپنے ہم قوم کے یہاں ٹک گئے۔ ڈیرہ میں ایک بزرگ تہجد گزار رہتے تھے اُن کے مرید بھی ہو گئے۔ اور دریاں بننے لگے۔ محلے کے بیکار لونڈوں کو ارد گرد جمع کر لیا اور سب کو کچھ نہ کچھ کام سے لگا دیا جب کاروبار اور بڑھا تو کپڑا بننے کا بھی ڈھچر ڈالا۔ لوگ اُستاد کے نام سے یاد کرنے لگے اب استاد اپنے پیر کی خدمت کرتے ہیں اور محلہ بھر کے نوجوان اُستاد کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اُن کے طفیل میں چار پیسے کماتے ہیں۔ اگر کسی کو روپئے دو روپئے کی ضرورت ہوئی تو اُستاد بلا تکلف جیب سے نکال کر دیدیتے ہیں۔ اگر سو دو سو روپئے کی ضمانت کی ضرورت ہو تو بھی استاد مُنھ نہ موڑیں گے۔ پرونوٹ پر دستخط کرانا ہو تو اُستاد کے پاس چلے جائیے۔ کئی مرتبہ روپیہ ڈوبا بھی گیا۔ یار لوگوں نے قرض لیکر پھر صورت بھی نہ دکھائی۔ مگر اُستاد نے اپنی وضعداری مرتے دم تک نہ چھوڑی۔ اُن کی

نیک کمائی میں نہ معلوم کہاں کا گولر کا پھول پڑ گیا تھا کہ باوجود گدھوں سے کھیت چروانے کے کام چلا ہی جاتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایک اور غیبی خرچ اور بڑھ گیا یعنی اُن کے پیر صاحب کا وصال ہو گیا۔ جہاں وہ عبادت کیا کرتے تھے وہیں دفن بھی ہوئے۔ اُستاد نے مقبرہ بنوا دیا اور اُسی جگہ بیٹھنے لگے۔ اُن بزرگوار کو کسی بزرگ سے خاندانی تعلق تو تھا نہیں خود رَو تھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مرحوم کا خانوادہ کون تھا لیکن محلہ والوں نے اظہار شکر گذاری میں ہمارے اُستاد کو اُن کا سجادہ نشین بنا ہی دیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت صاحب کا مقام عشق تھا اسلیئے اُن کا جانشین نہ ہونا چاہیئے۔ اُن میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھوں نے اُستاد کا روپیہ مار لیا تھا۔ ضمانت ضبط کرادی تھی یا جن کے قرض کی علت میں استاد کے یہاں قرقی آچکی تھی۔ جب اُستاد کو معلوم ہوا کہ اُن کی سجادگی کے کچھ لوگ مخالف بھی ہیں تو انھوں نے معافی چاہی مگر اُن کے طرفداروں نے کہا کہ اگر حضرت صاحب کا مقام عشق تھا تو آپ کا بھی تو مقام عشق ہے۔ بیچارے اُستاد اسکو بالکل نہ سمجھے کہ مقام عشق کیا ہوتا ہے اور ہچکچاتے ہی رہے۔ لیکن اُن کے طرفداروں نے نہ مانا اور از راہ مزید احتیاط اُن کی پیرائی کے ساتھ ان کے دو بول شرع کے بھی پڑھوا دیئے۔ اب تو استاد کے بھی مقام عشق کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا لہٰذا سجادگی قبول کر لی۔ سجادگی کے بعد دو تازہ آفتوں کا نزول اجلال ہوا

ایک تو کام کاج کا وقت کم ملنے لگا۔ کیونکہ عقیدت مندوں کا مجمع زیادہ رہنے لگا۔ اور جو وقت بچتا تھا وہ صبح اور شام کی قوالی میں صرف ہو جاتا دن بھر میں رومال دو رومال جو بنتے بھی وہ قوالوں کی نذر ہو جاتے تھے۔ دوسری آفت یہ تھی کہ شام کو جب آستانے پر محفل سماع ہوتی تھی تو مخالفین دور سے آوازے تو ازے کستے تھے اور مختلف جانوروں کی آوازیں نکال نکال کر رنگ بگاڑتے تھے۔

جس وقت اُستاد شروع آئے تھے تو تمام اہالیان قصبہ اور پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں ہو آئے تھے۔ مگر کچھ طبیعت کی مناسبت سے ہر گت ہم ہی سے ملتی تھی۔ مرحوم مجھ کو بھائی شاب کہتے تھے، اور میں بھائی صاحب شیخ جی اُستاد جو کچھ منہ میں آتا تھا کہہ گذرتا تھا بُرا نہیں مانتے تھے۔ مجھ کو اپنا بہی خواہ جانتے تھے اور اگر کوئی مشکل آن پڑتی تھی تو اپنی صاف دلی سے صرف مجھ سے مشورہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس پر کاربند بھی ہوتے تھے چنانچہ جب اُوں اُوں یُوں یُوں۔ گگڑوں کوں اور سیٹیوں نے بہت زور باندھا تو میرے پاس دوڑے آئے۔ اور پورا واقعہ بیان کیا۔ اپنے ہم وطنوں کے مزاج سے کون نہیں واقف ہوتا۔ اسلئے میں سمجھ گیا کہ چونکہ اس میں کوئی پڑھا لکھا آدمی یا خاندانی صوفی نہیں شریک ہے اس لئے یہ پریشانیاں ہیں۔ بس میں اُن کو اُسی وقت لئے ہوئے ایک خاندانی بزرگ

کے پاس چلا گیا۔ اور درخواست کی کہ اُن کی دستار بندی کر دی جائے چنانچہ چند عمائدین کی موجودگی میں یہ متبرک رسم ادا کی گئی۔ اور ہمیشہ کیلئے فتنہ فرو ہو گیا۔ اس کارروائی کے پہلے میں نے شیخ جی سے وعدہ لے لیا تھا کہ بیعت نہ لینا۔ اور مرحوم نے جیسا وعدہ کیا تھا ویسے ہی عمر بھر پیری مریدی سے بھاگتے رہے۔ یہ سب کچھ تو ہو گیا مگر روزمرہ کا بڑھتا ہوا خرچ کہاں سے آوے۔ اگر اکیلے ہوں تو توکل پہ کام چل جاوے۔ اپنا اور دو بڑھیوں کا پیٹ کر گہ چلا کر بھر لیں مگر دس پانچ عقیدت مندوں کی روٹیاں چلانا تو نوسیکھیئے متوکل سے بھی نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ آمدنی کیونکر بڑھائی جائے۔ بعد غور و فکر لکڑی کی سوداگری کی ٹھہری اس سن وسال میں بلا کا محنتی بزرگ تھا۔ اور دوسروں سے بھی کام کے لینے کا بادشاہ تھا۔ شروع میں دو ایک ٹھکے اُٹھائے مگر اس کے بعد لکڑی کا کاروبار ایسا چمکا کہ ٹھیکیوں پر ٹھیکیاں لگ گئیں تعمیری لکڑی۔ ایندھن کی لکڑی۔ تہمڑے۔ سلیاں ہر چیز کا اڑم لگا ہے۔ روپیہ برسنے لگا۔ ایک آرزو اُستاد کے دل میں وقتاً فوقتاً اُبھرتی تھی جس کو میں روکتا رہتا تھا۔ اب اُس کا موقع آ گیا۔ یعنی اہل قصبہ کی دعوتیں کرنا۔ کرتے پہلے بھی تھے۔ لیکن اتنو چھوٹی گھوڑی بھوسیلے گھڑی: جب دیکھو دعوت بولے بیٹھے ہیں۔ مفت خوروں کی کمی کب رہی ہے۔ آج

چائے کی دعوت ہے تو کل دھو بیا پلاؤ کی دیگ دم ہو رہی ہے۔

شہدوں کے بادشاہ کو دھاوت کہتے ہیں۔ گالیاں دینا ہو۔ مارنا ہو۔ کھانا کھانا ہو یا مار کھانا ہو۔ دھاوت سے اُمید کیجاتی ہے کہ ان خصوصیات میں بڑے سے بڑا شہدہ اس کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرے گا اسی طرح ہمارے شیخ جی دو چیزوں کے دھاوت تھے ایک اپنا کام کرنے کے۔ دوسرے اوروں کے کام آنے کے۔ صرف یہی نہیں کہ دوسروں کے پرونوٹ پر دستخط کر دیتے تھے اگر کسی کا کام ہو تو شیخ جی دو چار کوس دوڑ ابھی دو۔ محلے والوں پر کوئی مصیبت آئے ہمارے اُستاد سینہ سپر کئے کھڑے ہیں۔ حضرت عیسٰی علی انبیاد علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ دوسرے کے الزام کا فیصلہ کرنے نہ بیٹھو مبادا کہ تمہارے الزام کا فیصلہ ہو۔ صاف بات ہے۔ ہمارے اُستاد کو یہ گر کسی نے پڑھایا نہ تھا۔ مگر جس طرح درخت کی چھوٹی سی شاخ کو بھی جڑ سے غذا پہنچا کرتی ہے اسی طرح اُن کے دل کی شاخ بھی کسی بڑی جڑ سے آبیار تھی۔

اسوجہ سے کسی کے کام آتے وقت اُستاد کے یہاں مستحق غیر مستحق کی شرط نہ تھی اتفاق کی بات محلے میں ایک عورت کے لڑکا ہو پڑا۔ شوہر اُسکا برسوں سے باہر تھا لاحول ولاقوۃ۔ لوگوں نے ایسا تعجب کیا گویا ان ہونی بات ہوگئی۔ ہمدرد عورتیں جو آڑے وقت میں کام آئی تھیں، ماں کی ہمدردی

میں بچے کو کوسنے دینے لگیں۔

ایک عورت۔"موا آیا ہے منھ میں کالک لگانے کو۔ اور دیکھتی ہو کیسا ہٹا کٹا ہے جیسے مہینہ بھر کا پالا جلایا ہو۔"

دوسری عورت۔"جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب گھٹی بھی بناؤگی یا کوسنے ہی دیتی رہو گی۔"

پہلی عورت۔گھٹی نہیں سنکھیا۔ اِن کے لئے گھٹی آدیگی۔"

پڑھنے والوں کو سنکر تعجب ہوگا۔ مگر واقعہ ہے انھیں عورتوں میں سے ایک نے ذرا سا بیڑا توڑ کر اُس کے منھ میں رکھدیا۔ بچے نے رونا بند کر دیا اور منھ چلبلانے لگا۔"اوئی بہن یہ کون بلا پیدا ہوئی ہے۔ دیکھا تم نے۔" یہ تعجب خیز خبر گھڑی بھر میں پھیل گئی کہ کھاتا پیتا لڑکا پیدا ہوا ہے۔ لیجئے صاحب جو بات چھپائی جاتی تھی وہ ہر شخص کے کان میں پڑ گئی۔ حلالی لڑکے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مگر حرامی لڑکے کی شہرت کا بہانہ ہاتھ آیا ذکر عیش نصف عیش اپنا جنسی معاملہ نہ سہی دوسرے کا سہی۔ مگر ہے تو مزے کی بات۔ جس کو دیکھو بیٹرے برفی کا دونا ہاتھ میں لئے چلا آتا ہے۔ رفتہ رفتہ پولیس کو خبر ہوئی۔ باپ کا نام پوچھا گیا ماں نے اندھیرے کی آڑ پکڑی۔ اب کیا کیا جائے۔ کسی لونڈے نے لپک کر اُستاد کو خبر سُنائی کہ تھانہ سے دوڑ آگئی ہے۔ اُستاد

مع چند شاگردوں کے پہونچ گئے۔ تمام مجمع کو ڈھارس ہو گئی۔ باپ کا پتہ نہیں۔ لڑکا گپ چپ کالڈو کانسٹبل اس بات پر اڑا ہوا ہوا ہے کہ باپ کا نام معلوم ہونا چاہیئے اتنے میں مجمع سے ایک آواز آئی۔ ارے اُستاد ہی کا نام لکھ لو۔ بڑا قہقہہ پڑا اگر یہاں ہمارے شیخ کو کھلی بازی سے کیا واسطہ۔ یہ ویسے ہی سنجیدہ رہے بعض شاگردوں نے ایسے ذلیل خیال پر ناک بھوں چڑھائی ہی تھی کہ کسی نے کہا۔ ارے اُستاد تو محلے بھر کے ماں باپ ہیں۔ اس لڑکے پر کیا۔ خبر گیری تو یہی کریں گے۔ کانسٹبل ہنس کر وکیوں شیخ جی کیا کہتے ہیں آپ "شیخ جی"۔ جو چار بھلے مانسوں کی رائے ہو مجھ کو منظور ہے۔ کانسٹبل "۔ تو لکھ دیا جائے آپ کا نام "شیخ جی" لکھ لیجیئے۔ دن یونہی گذرتے گئے شیخ جی کا کام چلتا رہا پھر اُن کا گھر بیماریوں نے دیکھ لیا تھوڑے ہی دنوں میں دونوں بڈھیاں یکے بعد دیگرے چل بسیں۔ شیخ جی اسی طرح راضی برضا رہے۔ اس کے بعد لوگوں نے صلاح دی کہ کہ گھر میں کوئی چراغ جلانے والا ہونا چاہیئے۔ شیخ جی بولے "بھائی آپ لوگوں کی جیسی صلاح ہو چنانچہ ایک عقد اور پڑھوا دیا گیا اس وقت تک شیخ جی پر بہت مصیبتیں پڑیں مگر اس

مرزا منش

یاد احباب کے سلسلے میں الف ب پاس سب ہی آجاتا ہے۔ قصہ بھی میرے بچپن کا ہے بہت سی باتیں خیال سے اُتر گئیں ہونگی۔ ہماری یاد کے یہ دو بھائی تھے بڑے کا نام مرزا عابد اور چھوٹے کا مرزا سجاد تھا ان لوگوں نے بہتر دن دیکھے تھے اور انکے خاندان والوں کا بڑا زمانہ تھا۔ عالی ہمتی اور دولتمندی کی نشانیاں آج بھی کھنڈر کی صورت میں باقی ہیں ان کے مورث کئی پشتوں سے ردولی میں آکر بسے تھے سب صاحب جائداد۔ مرزا سجاد کے نانا بھی جاگیر دار تھے جن کا مکان امام باڑہ بائیں باغ۔ ٹوٹے مگر با وقعت گواہ ہیں مرزا صاحب کے والد کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تھی اس سلسلے سے ان دونوں بھائیوں نے تربیت یا بے تربیتی لکھنؤ میں حاصل کی تھی۔ یہ تو پرانی باتیں ہوئیں اسوقت خاندانی اور اکتسابی صفات غریبی کی وجہ سے حسب ذیل پائے جاتے تھے۔

بہادری، سیر چشمی، قدر کی لڑائی مع اپنے دوسرے لوازم کے، اصول خرچی، دوستی کا نباہ، ڈنڈے بازی اور ضرورت پڑے تو چکو بازی بھی۔ چھوٹے چھوٹے مشاغل مثل مرغ بازی بٹیر بازی کے شریفانہ زندگی کی علامتیں تھیں۔ بڑے بھائی کو ان چیزوں کا شوق خاندانی روایات کی وجہ سے رہا ہوگا مگر ہم نے جب دیکھا تب صرف چھوٹے بھائی انکا ک

رکھتے تھے۔ مرزا عابد اپنے چھوٹے بھائی کو اولاد کی طرح چاہتے تھے اسی وجہ سے ہر شوق میں چھوٹے بھائی کی پشت پناہی کیا کرتے تھے۔ گذراوقات کے لئے لکھنؤ میں ایک ? سدابرت تھا جو پچاس ساٹھ برس دہر خوب ٹھاکیا اور اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتا ہے یہ سدابرت اُن پرانی چیزوں کا ہوتا ہے جو بگڑے رئوسا رکاروباری زندگی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے احباب یا دوسرے آدمیوں کے ذریعہ سے بیچا کرتے ہیں۔ اس میں ہزاروں چیزیں ہوتی تھیں۔ سونا، چاندی جواہرات، شال کے ریزے، پرانی چینی، تصویریں، قلمی نسخے، اس کو سدابرت اس لئے کہا گیا ہے کہ بگڑی سرکاروں سے یہ چیزیں برآمد ہوتی تھیں اور سوا اُن سرکاروں کے سب کو مالامال کردیتی تھیں۔ مرزا صاحب بھی یہی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ عطر کچھ قوام کا تمباکو وغیرہ بھی رکھتے تھے۔ اسی طرح دوڑ دھوپ کرکے چھوٹے بھائی کے شوق اور گھر کی روٹیاں پوری کیا کرتے تھے اُنکی طبیعت میں نرمی بردباری تھی مگر خاندانی خصوصیات ضرورت کے وقت اُن میں بھی موجود تھے۔ قصہ مختصر بس یہ سمجھ لیجئے کہ مرزا عابد شری رامچندر جی کی طرح نرمی بھی برت سکتے تھے مگر مرزا سجاد لچھمن جی کی طرح سُپرنکھا کی ناک کاٹنے پر تُلے ہی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر محلے والے ان حرکات سے پریشان ہو کر شعر کہنے پر اُتر آئے تھے۔

کریا بہ بخشائے بر حال ما

ردولی سے آئے ہیں دو ظالماں

ہمارے دونوں مرزا منش مُرغ اور بٹیر کی پالیوں میں بازیاں اُسی انداز سے بدتے تھے جیسے آغا خان یا مہاراجہ بڑودھا گھوڑ دوڑ کھیلتے ہیں کہ حیثیت میں جتنا ہاتھ آیا اس سے پچاس گُنا زیادہ خرچ ہوگیا مثلاً فتح بٹیر یا مُرغ کی سواری دولہا کی طرح حضرت عباس کی درگاہ جاتی تھی چڑھاوے چڑھتے... نذریں دیکاتی تھیں، جب جائدادیں بھاجنوں کے بھینٹ چڑھ گئیں تو بازی لگاتے وقت نفع نقصان کا بھی خیال ہونے لگا۔ ضرورت نے دوسروں کے مال پہ اُدہر کی بازیاں لگانے پر مجبور کیا۔ آج جتنا پیسہ فلش، تسولو میں گھڑی بھر میں نکل جاتا ہے۔ اتنا دو دن تکون چوگون میں دن بھر میں نہیں نکلتا تھا مگر اس زمانے میں روپیہ اسقدر تھا کہاں۔ تب بھی تباہی پھیلانے کو جتنا تھا وہی کافی تھا۔ رہا لطف حضرات اس کی نہ پوچھیئے۔ انگریزی کھیل گالف دیکھنے میں بڑا نرم کھیل معلوم ہوتا ہے نہ کوئی جوش نہ خروش۔ گھما گھمی نہ طنطنا۔ کاندھے پہ لکڑی رکھے کف دست میدان طے کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں کیڈی یعنی لکڑیاں لادنے والا لونڈا اُدھر میں لگا ہے۔ دیکھنے والے کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یوں ہی گشت کی ٹھہری ہے یا کوئی نتیجہ بھی نکلے گا۔ مگر جو لوگ جانتے ہیں وہ جانتے ہیں

جو نہ جانتے ہوں جان لیں کہ ہاتھ خالی جانے پر جز بز ہونا۔ پاؤں پٹخنا۔ دانت پیسنا۔ ڈیم کی جھڑ باندھ دینا۔ کھیل کے پٹخارے کو کانی جوکھا کر دیتا ہے۔

اسی طرح بٹیر بھی دیکھنے میں تو مٹھی بھر پر ہے مگر جب لڑتا ہے تو دونوں پالنے والے اس سے کٹڑے لڑتے ہیں حریف کا بٹیر جو لات مارتا ہے وہ پلنے والے کے سینے پہ ہو گری ہو کر پڑتا ہے جو منھ مارتا ہے وہ بٹیر باز کے کلیجے میں برچھی کی انی ہو کر چبھتا ہے۔ پھر اس کے بعد حریف کے زبان کی چوٹیں تیر تلوار کا کام کرتی ہیں تلوار کا زخم اچھا ہو جاتا ہے زبان کا زخم تب ہی بھرتا ہے جب دوسرا تیر ہمارا ابھی ترازو ہو جائے اور ہم بھی چبھتے جلے تیز فقروں سے کسر نکال لیں۔

مرزا صاحب کا ایک بٹیر صوف کرتا تھا اور حریف کا گلا پکڑ کر جھنجوڑیاں بتاتا اور سینہ تان کر پر پھلا کر مقابل کو ڈھکیل ڈھکیل کر پالی باہر کر دیتا تھا اور پھوڑنے کے پچھلے پوتے میں پنجے گڑو کر ایسی لات بتاتا تھا کہ بٹیر باؤلا ہو جاتا تھا۔ اس صوفی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی جس دن نواب الن صاحب کے کھر دے کو اس نے بھگایا ہے بڑی شدت ہوئی۔ نواب کے بٹیر نے بڑی ارادہ دانی مگر صوفی نے وہ صوف کیا کہ حریف نوک دم نکل گیا مرزا صاحب کی لمبائی کی رعایت سے نواب صاحب کے مصاحبین کی طرف سے شور تھا مار بٹیرا ڈہینک کے مرزا نو صاحب کی داڑھی کی رعایت سے پکار رہے تھے ہاں بیٹا گل چھوڑ دے

کی ٹھیک آج نکل جائے۔ مرزا کا شیر بڑھ گیا پھر کیا تھا مرزا صاحب کے طرفداروں کی چڑھ بجی تھی۔ قریب تھا کہ شہر کی جگہ آدمی لڑنے لگیں مگر نواب صاحب خاندانی شائستہ ان لوگوں کے مُنھ کیا لگتے۔ مصاحبین بھی کیچڑ دل میں بے موقع ٹھکن پڑ جانے کے خیال سے طرح دے گئے۔

خیر یہ تو لکھنؤ کے لوگ تھے! اگلا جمعہ ایسا پڑا جس میں باہر والوں سے مُقد تھی۔ پٹھان لوگ یوں ہی لڑنے کو تیار رہتے ہیں نہ کہ جب بازی بڑھ جائے۔ دو چار موقع ایسے ہو چکے تھے جن میں شیر کسی کا بڑھے مگر آدھی باہر ہی والوں کے زوردار رہتے تھے دیہاتی گانوں... کی لونگ لاٹھیاں باندھے فوجداری کے نہ معلوم کتنے میدان سر کئے...... لکھنؤ والوں پر ایسی دھونس ڈالتے تھے کہ ان غریبوں کی زبان بند ہو جاتی تھی مُنھ پر ہوائیاں اُڑنے لگتی تھیں۔ مرزا سجاد کہنے لگے یار ان لوگوں نے تو کچا کر لیا ہے۔ جب دیکھو دہل لیتے ہیں کیا لکھنؤ والے ایسے بیٹھے ہو گئے کہ جس کا جو جی چاہے کہہ جائے اور ہم کھا رہیں۔ دو چار منچلے نوجوان تیار ہو گئے۔ جمعہ آیا اگونگے نواب کی بارہ دری میں بازی تھی۔ دو چار شرفا جن کو اس شادی کی دُھن گن مل چکی تھی گھر ہی سے نہ نکلے۔ باقی لوگ مرزا سجاد کی سرکردگی میں پہونچ گئے۔ دیہات والوں کا غول بھی پہونچ گیا تھا کہ کرنیہ تو پہنچ چکے تھے دو ایک لوگ ابھی راہ پر تھے۔ ان کی بھی لڑائی ختم ہوئی لکھنؤ والوں کا پالا بہت گرم رہا ایک شیر بھی اُن کا

نہیں بھاگا نہ برابر پر چھوٹا۔ اب بٹیروں کی باری آئی مرزا صاحب نے
ایک نئے بٹیر پر اعتبار کیا تھا جس بٹیر سے اس کی ضد ہوئی تھی وہ دو بٹیر
بھگا چکا تھا۔ اس لئے ابکی مرزا صاحب کا بٹیر اس کے مقابلے پر آیا تھا۔
مرزا کے بٹیر نے کابک سے نکلتے ہی ٹھاٹھ کیا۔ مرزا صاحب کی چھاتی پھاٹ
ہوگئی مگر اتنا بڑا کھلاڑی ایک بات میں چوک گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ آج جیت
کی خوشی میں احتیاط ہاتھ سے جاتی رہی تھی حریف کا بٹیر ان کا بیجانا ہوا ضرور تھا مگر
چوک یہ ہوئی کہ اس کو آج بھر اچھی طرح دیکھا نہیں لیجئے صاحب لڑائی
شروع ہوئی ارے یہ کیا غضب ہوا۔ ہر منھ پر مرزا صاحب کا بٹیر سوکھتا
چلا جاتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے بٹیر کے منھ میں پر آگیا
اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو حریف کے بٹیر کے نوک نیچے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیا
ہوا اتنے اتنے بڑے مبصروں کا مجمع اور جیت کی خوشی میں آنکھوں پر ایسے
پردے پڑ گئے کہ اس چین پر کسی نے نظر ہی نہ کی۔ ایں یہ کیا ہے! مرزا
صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ بٹیر نکل گیا۔ وہ مارا کا شور ہوا ایک طرف
سے آواز آئی کل مغل توپن۔ مرزا صاحب کے مورث بکسر میں کیست لیے
تھے۔ شجاع الدولہ کی شکست کی یہ تاریخ ہوئی تھی۔ مرزا اپنے جواس سے ہو گئے
گئے آنکھوں پر پردے پڑ گئے حریف کا بٹیر دانے پر لگا تھا مرزا صاحب نے
اٹھا کر ٹیخ دیا۔ خاں صاحب مرزا سے لپٹ گئے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کرنے

کے بجائے اپنی اپنی پالی الگ الگ قائم کر دی۔ لات، گھونسا، طمانچہ، گتھم گتھا، گدم ٹھنی کا بازار گرم ہو گیا۔ کا بکیں ٹوٹی پڑی ہیں۔ انگریز کے عشاق سا گریباں ہو گئے۔ مرزا صاحب کے بڑے بھائی جو الگ بیٹھے تھے وہ بھی اکھاڑے میں اُتر آئے۔ اتنے میں پٹھانوں نے لاٹھیاں سنبھالیں گو کہ نواب کی بارہ دری کوئی اینچ خاں کا میدان تو تھا نہیں جہاں لاٹھیاں گھوم سکیں۔ لکھنؤ والے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے آستینوں میں لئے تھے بند جگہ پر خوب کام کرنے لگے۔ بڑی گھمسان ہوئی وہ یورش پڑی کہ رن بجنے لگا۔ ہمارے مرزا ہیں کہ بھیڑ بھیڑ کے حملے کر رہے ہیں۔ بانک بنوٹ، بچھوا ظفر پیکر کے کمالات دکھا دکھا کر لوگوں کے دل بڑھا رہے ہیں۔ پٹھان بڑی بودی مار کھا رہے ہیں اتنے میں کسی دیہاتی نے چکو چلا دیا ہائے کا نالہ مار کر نواب للّن صاحب کا ایک عزیز گر پڑا۔ خون دیکھ کر لڑائی کے خاتمہ کی صورت بندھی۔ دیہاتی مثل ہے کھائے اور بڑ رہے مارے اور ٹل رہے بلہوا لو نے جانا قتل ہو گیا، وہ تو صفائی دینے کی فکر میں اپنے گھروں کو بھاگے۔ لکھنؤ والوں نے بھی دیکھا معاملہ سنگین ہو گیا۔ اتنے میں لال پگڑی دور سے دکھائی دی۔ اب کیا تھا جس کے سینگ جدھر سمائے نکل گیا۔ بارہ دری میں دو چار چٹیل گھلیے پڑے اور فاتح جنرل مرزا اکھڑے ہیں گذشتہ مہابھارت کے آثار بتانے کو چالیس پچاس جوڑے جوتے اِدھر اُدھر دکھائی دے رہے

ہیں۔ دوسروں کے تو خیر معمولی چوٹیں کھرونچے، گلم۔ موچوں کے آئی تھیں۔ جس شخص کے چاقو لگا تھا وہ البتہ لہولہان سانس نہ ڈکار غش میں پڑا تھا مارنے والے نے بڑا کاری ہاتھ پیٹ پر مارا تھا مگر خدا کا کرنا ایسا کہ کنجی کے چھلّے میں چاقو کی نوک پھنس کر اِدھر سے اُدھر تک صرف ایک گہرا سا خط دیتی چلی گئی تھی۔ زخمی نے دو پشتوں کی غلامی میں اتنا خون اتنا لمبا زخم کاہے کو دیکھا تھا۔ بے تکلف جان بحق تسلیم ہونے کے ارادے سے لیٹ گئے، غش بھی آ گیا۔ انکے خیال میں وعدہ پورا ہو رہا ہے۔ ابھی پولیس تحقیقات ہی کر رہی تھی کہ انکے گھر والوں کو خبر ہوئی۔ تو محلّے میں چل سر و پا برہنہ مرد اور بین کرتی ہوئی ڈولیاں سینہ کوٹتی ہوئی آن آئیں چھو چھو خادمائیں۔ مہربانوں ایک تانتا بندھ گیا۔ پولیس نے ایک سالم نہ سنی مضروب کو معائنہ کے لئے اسپتال چلتا کیا اور مرزا صاحب کا چالان بولدیا۔ اس معاملے نے ایک نئی صورت پکڑ لی یعنی ہر شخص پورے واقعہ کا ذمہ دار سجاد مرزا صاحب ہی کو ٹھہرانے لگا۔

عدالت کے جھمیلے سے تو یوں چھٹی ملی کہ ڈاکٹر نے صرف ضرب خفیف لکھی مرزا صاحب اس طرح بچے کہ ملزم تو ضرور حوالات میں تھا مگر مستغیث کا کہیں پتہ نہ تھا عربی قواعد میں ایسا مفعول بھی ہوتا ہے جس کے فاعل کا پتہ نہ ہو یہاں ایسا فاعل تھا جس کا مفعول ڈھونڈھے نہ ملے خیر بڑی لعنت سے بچے۔ مرزا سجاد کے انگریز بیوی سے پولیس یوں ہی پریشان تھی۔ محلّے والے روز ان کا دکھڑا روتے تھانے پہونچا کرتے

تھے۔ لہذا تھانیدار صاحب نے انکو بلاکر کہا کہ اگر تم اپنی خیر چاہتے ہو تو لکھنؤ خالی کردو۔ نہیں تو ہم تم کو بے کرائے کے گھر پہونچائے بغیر دم نہ لیں گے مرزا کیا نہ کرتا بیچارے لکھنؤ چھوڑ کر اپنے موروثی وطن ردولی پہونچے۔ یہاں بھی گھر گر چکا تھا۔ اپنے ماموں کے یہاں رہنے لگے۔ بڑے بھائی محبت میں جب چھٹی ملتی تھی آکر دیکھ جاتے تھے۔ پھر چلے جاتے تھے۔ اگر وہ بھی یہاں رہ جاتے تو پیٹ کہاں سے بھرتا۔

اس تازہ مصیبت سے تکلیفیں بڑھ گئیں تھیں مگر عمر بھر کی پڑی ہوئی عادتیں کیسے بدلتیں۔ وہی ڈھنڈا وہی باتوں کا انداز وہی شرافت کی جھلک رہے ہتھکنڈے ابھی اس سے شرافت کو کیا بٹا لگتا ہے اہل وطن بھی حسب المراج ملک، غریبی کو الگ چھوڑ کر انکی قدر کیا کیے اگر کوئی سیدھی طرح بولا تو مرزا سجاد انکسار سے جھک گئے اگر کسی نے امیری کی لی تو مرزا سجاد ماش کا آٹا ہو گئے۔ ماموں صاحب بھی پریشان حال تھے صرف گنڈا، تعویذ فال کھولنے پر گذر اوقات تھی مگر

طبل و علم ہی پاس ہے کچھ اپنے نہ ملک و مال

ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

بھانجے کو اسی طرح گلے لگایا۔ رہو جو کچھ میسر ہو تم بھی کھاؤ نہ ملے تو یونہی پڑے رہو۔ ایک دن مرزا عابد آئے تھی فلاکت پریشانی کا دکھڑا رو دیا جارہا تھا کیونکہ ہم ہی چلاتے۔ بھلے کو اس وقت مرزا عابد کے پاس روپیہ تھا۔ ڈیڑھ سو

نکال کر گھٹ سے گن دیتے اب مرزا صاحب یکے والے ہو گئے۔ رہ وہی چھوٹی سی جگہ اور وہ بھی پچاس پچپن برس اُدھر کی۔ قصبے میں دو چار یکے پرانی گورکھپوری چال کے تھے جن میں رودھر سے ہم اسپتالوں کی بیساکھی کے ایسے لگتے تھے۔ کمانی دمانی کا کسی نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا چھوٹے بڑے کھانچوں کا پتا سواری کو اپنے سر کی دھمک سے چلتا تھا یعنی جتنا گہرا کھانچہ ہوا اتنا ہی زور سے بھیجہ ہل گیا۔ دوسری پہچان ایک اور تھی یعنی جتنا گہرا کھانچہ ہوا اتنا آدمی اُچکا اور سانتا ہی بڑا اگلم سر میں پڑ گیا۔ مرزا صاحب یکے نے لوگوں کی آنکھیں کھولدیں کہ ایسے آرام کی سواریاں بھی ہوتی ہیں مرزا صاحب نے بیاہ نہیں کیا تھا اولاد کہاں سے ہوتی۔ لہذا جتنی اولاد والی محبت اُن کو خدا کے یہاں سے ملی تھی وہ سب ٹٹو پر صرف ہوتی تھی جو دنیا میں جتنی ادہام پرستیاں اولاد کے معاملے میں ہوتی ہیں وہ سب یہاں پائی جاتی تھیں۔ مالش صفائی تو ہوتی ہی تھی صبح شام لوبان دیجاتی تھی نہ معلوم کتنی دعائیں دم کی جاتی تھیں ماموں ابا سے فال کھلوائی جاتی تھی جو رہا ہے پر زرد مٹھائی اور سفید پھول ہلدی کی گرہ سات لونگیں فال کے احکام کے مطابق رکھی جاتی تھیں۔ صبح کو جب یکہ نکلتا تھا تو گھوڑے کے ماتھے کی سفیدی پر ایکطرف سیاہ ٹیکہ کاجل کا لگایا جاتا تھا کہ نظر نہ لگے۔ گلے میں نیلا گنڈہ۔ کہربا کا دانہ تعویذ پنج کی تختی نہ معلوم کیا کیا پہنایا جاتا تھا۔ قصہ مختصر جو جو باتیں زہر عشق کے ہیرو کی والدہ نے انکے لئے کی تھیں نہ سب مرزا صاحب اپنے ٹٹو سلمہ کیلئے کرتے تھے۔ کبھی آنکھ بھر کے دیکھتے نہ تھے اگر کسی وقت مرزا کو

دیکھ کر ٹٹو ہنہنایا یا کوئی اڑاد اکنوتیوں کی جی میں کھپ گئی تو فوراً اپنی ایڑی دیکھ لیتے تھے کہ کہیں خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے لاکھ کوس دور ساقراق در میان دشمنوں کو نظر کا پھیر نہ ہو جائے۔

ٹٹو بھی جاندار تھا۔ پھر اس دیکھ بھال پر کیوں نہ بوٹی چڑھتی۔ اور بلے کے گھوڑوں کا شاہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ کٹ کٹ کٹ کٹ ایسی دلکی چلتا تھا کہ راہگیر کی نگاہ ٹھہرتی تھی اگر کبھی کسی جاننے والے نے تعریف کر دی تو مرزا صاحب سے گھگیانے لگے کہ بھئی ایسا نہ کہو حضور کو نظر لگ جائیگی شدہ شدہ گھوڑے اور مرزا کی یہ کمزوری لوگوں کو معلوم ہو گئی اگر سڑک پر کسی نے کہدیا واہ مرزا تو فوراً مرزا نے بڑی زور سے جھپٹا دے کر ایکبارگی گھوڑے کو روک لیا اور تعریف کرنیوالے سے بیلے بیلے پڑنے لگے۔ کوئی ہنس دیا کوئی مرزا کا قد اور بدلی ہوئی نگاہ دیکھ کر دب گیا چونکہ گھوڑا واقعی جاندار تھا اسلیئے ان جان لوگوں سے یہ غلطی اکثر ہو جاتی تھی اور مرزا ہمیشہ زور کا جھٹا دیکر بگیہ روک لیتے تھے کہ جتنی نظر لگ چکی ہے اتنی ہی رہے زیادہ نہ ہو۔ رفتہ رفتہ گھوڑا جھٹکے سے ایسا ور گیا تھا کہ کسی نے واہ کہا نہیں اور گھوڑا سہم کے رکا نہیں۔

اب تو لونڈوں کو شغلہ ہاتھ آیا۔ جدھر سے مرزا نکلتے ہیں واہ مرزا کی آوازیں آ رہی ہیں گھوڑا اکھڑا ہوا ہے اور مرزا صاحب ہیں کہ نیچے اترے کوڑا ہاتھ میں لئے لونڈوں کی نانیوں دادیوں اور انکے خاندان کی دوسری عورتوں کے جنسی رجحان کی بکھان مختلف انداز مختلف پیرایوں سے بالاعلان کر رہے ہیں جس میں شاعرانہ پہلو پر نظر رکھتے ہوئے اپنا تخلص بیچ بیچ ڈالتے چلے جاتے ہیں

میر باقر صاحب

سید محمد باقر رضوی المشہدی ثم امرد لوی مرحوم مضافات ردولی موضع ابردلی سادات کے رہنے والے تھے انکے بچپن میں ان کے والد گورکھپور میں سرکاری ملازمت کرتے تھے اُن کے ماموں مرحوم بستی میں اچھے خاصے زمیندار تھے۔ ابردلی یا ردولی آتے تھے مگر کم۔ باپ کی نوکری کا سلسلہ ختم ہوگیا ماموں کا انتقال ہوگیا ناچار اپنے آبائی گھر واپس آئے۔ بچپن میں مجھ سے بتایا گیا تھا کہ کس بابا آدم کے رشتے سے یہ ہمارے چچا ہوتے ہیں چنانچہ ہم نے چچا کہنا شروع کیا۔ آخر میں تو اُن کو آدھی ردولی چچا کہنے لگی تھی۔ جگت چچا ہو گئے تھے۔ چار بھائی تھے۔ بھرا پُرا گھر تھا ماں کے پاس دولت تھی۔ ماموں کی زمینداری کے وارث تھے۔ انکے باپ یعنی سجاد دادا تو خاموش آدمی تھے شہد کی مکھی کے نر تھے مگر ہماری دادی بڑی منتظم تھیں اگر دروازے پر دس آدمی بے وقت پہنچ جائیں تو گھڑی بھر میں سب کو کھانا کھلا دیں۔ مہماں نوازی بلا کے بات کرنا اور ہر وقت کام میں لگی رہنا ایک ایک جملے میں تین تین قسمیں کھانا انکی خاص الخاص خصوصیات میں سے تھے۔ پہلی دوسری اور چوتھی صفت انکے بچوں کو پوری طرح وراثت میں پہنچی تھی اور حق بات کہنا چاہیئے ان صفات کو

ان لوگوں نے مرتے دم تک خوب نباہا۔ چونکہ اُن کی جائداد لبستی میں تھی اسلئے ردولی والے اُنکی دولت کا معیار نہیں قائم کرسکے مگر ان کا شمار خوشحال لوگوں میں ہوتا تھا۔ کچھ روپیہ بھی قرضے پر دیتے تھے اس لئے دولت گھٹنے کے بجائے بڑھنے کی اُمید کی جاتی تھی۔ شامت کہیئے یا تقدیر کا لکھا سید محمد باقر صاحب کی شادی ایک لکھ لُٹ رئیس کی لڑکی سے ہو گئی سب وہی عیوب ان لوگوں میں بھی سرائت کر گئے۔ خودداری نے سسرال والوں کا مقابلہ کرنے کا خیال دلمیں پیدا کیا خوشحالی میں پہلا گھن یہیں سے لگا۔ اس کتاب میں نواب راحت حسین مرحوم کی یاد موجود ہے۔ ہمارے نواب صاحب ہی کی بہن ان کو بیاہی گئی تھیں میر باقر۔ باقر سے میر باقر داماد ہو گئے۔ صفات کی نہ سہی نام کی نسبت تو بلند ہو گئی۔ جہیز میں جان لیوا دق بھی آئی جس نے انکی سسرال کا گھر اور نہ معلوم کتنے گھر کھائے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سجاد داد انے انتقال کیا یوں تو موت مکروہ ہے لیکن اگر ایمان کی پوچھیے تو کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ البتہ متذکرہ بالا مزاجی اور خاندانی خصوصیات اسوقت تک جو تھوڑے تھوڑے دکھائی دیتے تھے ان کا بھرپور مظاہرہ ہو گیا نواب راحت حسین صاحب مرحوم اپنے خاص انداز میں اس غم فزا واقعہ کی جو تصویر کھینچتے تھے اس سے شائد پڑھنے والوں کو بھی کچھ اندازہ ہو جائے۔

نواب صاحب کہتے تھے اس حادثے کے بعد سوا میر باقر صاحب کی والدہ کے کسی کے حواس برجا نہ تھے حالانکہ اُن کا غم حقیقی غم تھا مگر لڑکوں کے خیال سے موصوفہ نے مجھکو خاص اس کام پر تعینات کیا کہ لڑکوں کو تسلی وتشفی دوں ، رضا برضا رہنے کی تلقین کروں اور صبر کی خوبیاں ان لوگوں پر اچھی طرح روشن کروں۔ دفن کے پہلے تو خیر سب ہی گے اوپر اثر ہوتا ہے لیکن قبرستان سے واپس آنے کے بعد بیکاری میں رونے کا مشغلہ بہت ترقی پکڑ گیا، اس لیئے میں نے یہ تدبیر نکالی کہ میاں باقر کے چاروں بھائیوں کو یکجا نہ ہونے دوں۔ چنانچہ ایک کو میں نے صدقے کے کام کو دیکھنے کو کہا۔ دوسرے کو مہمانوں کی طرف بھیجدیا۔ دو چھوٹے تھے وہ بغیر دونوں بڑے بھائیوں کی مدد کے زیادہ آفت نہیں جوت سکتے تھے اسلیئے اُن کو دلاسا دیکر یوں ہی چھوڑ دیا اس کے بعد نواب صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں رفع حاجت کے لئے چلا گیا۔ وہیں سے سنا کہ پھر کہرام پڑ گیا میں نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ چاروں بھائی اکٹھا ہو گئے۔ جلدی جلدی واپس آیا کیا دیکھتا ہوں کہ سب کے سب جمع ہیں۔ اور نئی طرح کے بین کر رہے ہیں۔ ایک کہہ رہا ہے خدا کی قسم ابا مرحوم آٹھ آٹھ دن مُنھ نہیں دھوتے تھے اور اس پر سب ملکر بڑی زور سے روتے ہیں۔ پھر دوسرا کہتا ہے رسول مقبول کی قسم دانت بھی تو نہیں مانجھتے تھے۔ اور پھر وہی گھمسان پڑتی ہے۔ تیسرا کہتا ہے اور نہاتے کب تھے

قسم کلام مجید کی اماں کے ڈر کے مارے غسل خانے میں یوں ہی پانی پھینک کر چلے آتے تھے اور وہی شور مچتا ہے۔ جو تھا داڑھیں مار کر کہتا ہے کہ دو بجے رات کو مرحوم کا چھینکے سے ہانڈی اتار کر گپ گپ دہی بڑے کھانا یاد آتا ہے اس پر تو پوری نخل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی ہے۔ نواب صاحب کا رشتہ مذاق کا تو تھا ہی آپ کا بیان ہے کہ میں نے ایک ڈانٹ بتائی، اور کہا سالو! ابھی انکی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہے اور تم نے انکے یہ بکھان شروع کر دیئے۔ کچھ سچی بات کچھ مذاق کا پہلو کچھ نواب صاحب کی زبان کا اثر اظہار غم مدھم پڑ گیا۔
پہلے تو ہم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ نواب صاحب مرحوم کی شاعری ہے لیکن بعد کو تصدیق ہوئی کہ کچھ اصلیت بھی تھی۔ باقر مرحوم کے چھوٹے بھائی محمد جعفر مرحوم نے بیان کیا کہ راحت حسین منے روایت کرتے ہیں تدیّن سے کام نہیں لیا ہے، ہم لوگ تو صرف یہ کہتے تھے گو منہ نہیں دھوتے تھے مگر چہرہ چاند کو ماند کرتا تھا گو دانت نہیں مانجتے تھے مگر انکے آگے موتی بے آب تھے نہاتے کم تھے مگر اُن پر میل کچیل کا کبھی گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ رہی وہی بڑوں والی بات اس میں اعتراض کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔ اُن کا مال تھا کھاتے تھے راحت حسین کے باپ کا اجارہ۔

میرے پڑھنے والو آپ کو ہمارے ہیرو کی حسب ذیل باتوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا خودداری جہاں نوازی سسرالی رشتے سے امیری کی چھاؤں برور سے

بولنا اور قسمیں۔ مذاق کا چٹخارہ جو آگے چلکر بہت چوکھا ہوگیا موجود تو تھا مگر ابھی تک اس کے اظہار کا پورا موقع سوا معمولی ہنسی ٹھٹھے کے نہیں آیا تھا۔ البتہ ہنسی ٹھٹھے میں شروع ہی سے یہ حال تھا کہ میر باقر جہاں جاتے تھے وہاں محلے بھر کو معلوم ہو جاتا تھا اجنبی جگہوں میں تو یہاں تک ہوا کہ لوگ صبح کو انکے میزبان کے یہاں خیریت پوچھنے آئے۔

دوسرا باب اس ذرت کا اسوقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ اس گھر کی لچھمی اٹھ گئی یعنی میاں باقر صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا خرچ کی تنگی اب بھی نہیں تھی دو چار آدمی ابتک انکے قرضدار تھے۔ مگر وہ بات جاتی رہی تھی۔ پھر ان کا گھر بیماریوں نے دیکھ لیا دولت۔ بودگی زیادہ تر دوا علاج میں اور کچھ رکھ رکھاؤ میں ختم ہو گئی۔ بستی کی جائداد کا بھی وارا نیارا ہو چکا۔ یہانتک کہ تنگی سے بسر ہونے لگی۔ کثرت اولاد سے انکی مشکلیں زیادہ ہو گئیں چھوٹا بھائی جو انکے بڑے لڑکے کے ہمسن تھا اس کو پڑھانے میں دقتیں پیش آنا شروع ہو گئیں۔ غریبی بڑا سخت امتحان ہے اس امتحان میں پاس کا درجہ کسی کو ملجائے مگر آنرز ہزاروں میں کہیں ایک کو نصیب ہوتا ہے ہمارے ہیرو کا بھی یہی حال ہوا۔ کہ ادھر ادھر ملازمت کی تلاش کرنے لگے سن زیادہ کوئی ڈگری نہیں پابندی سے کام کے عادی نہیں۔ اگر کسی جگہ ٹھکانا ہوا بھی تو مصاحب کی صورت میں۔ ابتو انکی بذلہ سنجی ہنسی ٹھٹھے کی دھوم مچ گئی۔

اس کے بعد لڑکے جوان ہو گئے کوئی سو کما نے لگا کوئی د وسرہ - چھوٹا
بھائی وکیل ہو گیا مگر میاں باقر کی نہ کوئی ضرورت پوری کر سکا اور نہ انھوں
نے اپنا رویہ بدلا۔ گورکھپور بستی میں نشو ونما ہوئی تھی وہاں تاڑی شراب
کے قطرے بڑی بڑی ڈاڑھیوں پر دکھائی دیتے ہیں کسی طرح بدقسمتی سے
یہ بھی اس کے مزے سے واقف ہو گئے میں یہ ذکر ہرگز نہ کرتا کیونکہ یہ ذاتی
فعل ہے جس سے دوسرے کو واسطہ نہیں۔ یہ تذکرہ صرف اس وجہ سے آگیا
کہ بغیر اس کے ان کے واقعات ادھورے رہ جائیں گے۔ جوانی میں مجھکو
ایک کتاب آئرلینڈ کے متعلق پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا جس میں ایک خاص
کلب کے ممبروں نے یہ قسم کھائی تھی کہ مذاق کی بات چاہے اپنی ماں ہی کی کیوں
نہ ہو ہر ممبر ضرور بیان کریگا۔ میاں باقر نہ آئرلینڈ گئے تھے نہ اس زمانے
میں پیدا ہوئے تھے جب یہ کلب قائم تھا مگر کسی نامعلوم طریقے سے یہ اس
کے ممبر ہو گئے تھے اور ہنسنے کا چسکا ایسا پڑ گیا کہ اپنی بُرائی یا کسی کی بات
ہو اگر اس میں ہنسنے کی گنجائش ہوئی تو میاں باقر اس کے بیان کرنے سے
نہ رکیں گے بدقسمتی سے گھوڑ دوڑ کھیلنے کا بھی شوق ہو گیا۔ شوق کے بعد
عادت ہوئی عادت کے بعد لت ہو گئی اس شوق کے پیدا کرنے میں شاید
میری بھی کچھ ذمہ داری ہو بلکہ ضرور ہے، میں تو بچ گیا مگر وہ مرحوم فنا
فی الگھوڑ دوڑ ہو گئے۔ اس مشغلہ میں روپیہ کا خرچ اور یہاں پیسہ پاس نہیں

گمر انھوں نے ایک ترکیب نکالی کسی کرنل جنرل کا کوئی خانساماں تھا جس نے بہت سا اندوختہ کرنے کے بعد ریس کے احاطے کے اندر چائے وغیرہ کا ٹھیکہ لینا شروع کیا تھا۔ گھوڑ دوڑ کی آمد و رفت میں اس سے یاد اللہ ہو گئی اب راوی چین لکھتا ہے میاں باقر ہوٹل کا پاس لٹکائے ہوئے اول اسٹینڈ پر دوسرے اسٹینڈ پر پیڈک میں اصطبل میں ہر جگہ موجود تمام جاکیوں سے ملاقات اکثر بکیوں سے جان پہچان ٹپاؤنس سے ان سے ملی مار بہتر سے بہتر ٹپ انکو ملنے لگے مگر اس تباہ کن کھیل میں سوا جوا کھلانے والے کے اور کسی کو امیر ہوتے دیکھا نہیں پھر اس کے لئے بڑے سرمائے کی بھی ضرورت ہے یہاں ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے وہی روپیہ دو روپیہ کا کھیل مگر شوق پورا ہوتا رہا مجھ سے ان سے زمینداری وغیرہ کے معاملے میں شکر رنجی بلکہ اس سے بھی بڑھکر نوبتیں پہنچ گئیں معاملات نے اکثر بہت طول کھینچا مگر ہنسنے ہنسانے کے مراسم اسی طرح رہے مثلاً عرض کرتا ہوں ایکدن دوران ملال میں آئے کہنے لگے محمد علی قسم ہے کلام مجید کی تم ہزار ہمارے دشمن ہو جاؤ مگر خدا کی قسم ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ مذاق کا کوئی واقعہ پیش آوے اور تم سے نہ کہیں مگر دیکھو واللہ کسی سے کہنا مت۔

میں :۔ ہاں ہاں نہ کہیں گے۔ کہو تو۔

میر باقر :۔ ارے تم ضرور کہو گے قسم رسولِ مقبول کی تم بغیر کہے نہیں رہ سکتے

تمھارے پیٹ میں بات ہی نہیں رہتی اور تم کیا ہم خود کہیں گے مگر ابھی تازہ
تازہ واقعہ ہے قسم امام حسین کی اگر تم نے کہا تو مجھکو بہت تکلیف ہوگی۔

میں :۔ بالکل ٹھیک میں سمجھتا ہوں تم کہہ چلو۔

میر باقر :۔ چند طالبعلموں نے ملکہ امین آباد میں ایک مکان لے رکھا ہے۔
اس میں ہمارا چھوٹا بھائی بھی شریک ہے جگہ ضرور تنگ ہے مگر ان لڑکوں
کے اعزا کو ضرورت کے وقت ایک چارپائی کی جگہ مل ہی جاتی ہے۔
ہم جو ریس سے لوٹے تو وہیں چلے آج بڑا اچھا دن تھا قسم امام حسین کی
اگر ہمارے پاس روپیہ ہوتا تو آج امیر ہو گئے ہوتے تین گھوڑے ہمارے
نکلے ایک بلیس اور دو اوّل فیورٹ تو فیورٹ ہم کو تو آوٹ سائڈر
کی ٹپ ایسی ملی مگر کیا کریں صرف پانچ روپیہ بلیس پر لگائے پچیس ملے خدا کی
قسم آج پانچ ریسوں میں تو بکیوں کا دوالا نکل گیا۔ اچھا خیر۔ دل خوش تھا
اسلئے ذرا سی زیادہ پی گئے گھر پہنچتے پہنچتے نو بج گئے تھے زینے پر چڑھنے لگے
تو کیا دیکھتے ہیں کہ ردولی کے فلاں فلاں کتی ریشائیل بیٹھے ہیں بھلے کو زینے
پر اندھیرا تھا نہیں تو قسم خدا کی بڑا غضب ہوا تھا۔ ہم الٹے پاؤں واپس
آئے اب امین آباد میں اس ادھیڑ بن میں ٹہل رہے ہیں کہ جلنے کے جاڑے
ہم اس حالت میں کمبل لینے بھی نہیں جاسکتے۔ کیا کریں گے۔ ایک بڑھیا پان
بیچ رہی تھی اس سے گلوریاں لینے لگے وہ بھانپ گئی کہ نرم چارہ ہے کہنے لگی

یہاں کہیں ٹھکانا کیجئے گا قسم قرآن کی محمد علی میں نے کہا وہ دار السبب مشکلیں
بیچارگی حل ہو گئیں نہ لحاف کی فکر نہ رضائی کی نہ گھر جانے میں نصیحتے کا خوف
ہم تیار ہو گئے تم جانتے ہو کہ ہم کو ان باتوں کا شوق کبھی نہیں ہاں مگر یہ موقع ایسا تھا
کہ سوا اسکے اور کون صورت تھی اس بڑھیا نے ایک چھوٹی سی لڑکی ہمارے ساتھ
کی اس سے کہا میاں کو اپنی آپا جان کے یہاں لے جاؤ گلی در گلی وہاں پہنچے صورت
دیکھتے ہی کہنے لگی جنیا ہمیں بھی چلو اُدھر ایک اَدھا منگوایا۔ تعاملوا ثم
تعانیموا قرا ای ٹھہری۔ ہم تو پی چکے تھے اس کی خاطر سے ذری سی چکھ لی مگر وہ
اَدھے کا اَدھا چڑھا گئی اختلاط کی بے تکلفی میں ہماری وہ سکٹ میں جو دو ایک روپے اور
ریزگاریاں تھیں پان مٹھائی کے نام سے پہلے تو انہیں نے اینٹھے نوٹ وغیرہ نیفے میں ہاتھ پر
نہیں ڈالا اس کے بعد نشانی کے نام سے انگوٹھیاں لے لیں ہم کو اس طرح کا اتفاق کاہے کو
ہوا تھا مگر اسوقت حالت بھی کچھ ایسی ہی باتوں کی تھی بندھا خوب رکھا تھا ہے بھاری گھڑی
قریب تین بجے کے کھلی گھوڑ دوڑ سے لیکر اسوقت تک کے تمام واقعات نگاہ کے سامنے آگئے اپنے
اوپر غصہ اُن دارجیوں کے اوپر غصہ کچھ اپنی حرکتوں کا انفعال۔ لاحول ولا قوۃ مگر قسم
قرآن کی سب سے زیادہ غصہ اس چڑی پر تھا جب دیکھئے تو لٹے کیا ہوا تھا اور رہے کیا کچھ
گئی۔ انگلیاں خالی کر دیں چڑیل نے سادہ روہ فیروزہ بھی تو نہیں ہے اماں
کی نشانی تھی۔ اور وہاں فرنگ والی انگوٹھی بھی اینٹھ لی پھوپھی اماں مرحومہ
کے پیٹ میں جب درد ہوتا تھا تو دھو دھو کر پلائی جاتی تھی حرامزادی قحبہ قطامہ

شغل غیبانی اور دیکھو تو کیسی میٹھی نیند سو رہی ہے۔ رہ جاؤ ہم باقر کا ہیکو جو اس
کی کسر نہ نکالی ہو۔ بھیا میں اٹھا اور اس کا لوٹا پاندان گلاس پان کی ڈبیا سب
میں نے سنبھالی۔ دل نے کہا باقر شراب تو پیتے ہی تھے رنڈی بازی بھی کر گذرے اب
سب پہ طرہ یہ کہ اچکا پن بھی کر دگے۔ اس خیال کے آتے ہی مجھکو ہنسی کی گدگدی
اٹھی۔ یہ گدگدی پیدا ہوتے ہی تمام رکاوٹیں کافور ہوگئیں بڑے آہستہ آہستہ میں زینے
سے اترنے لگا۔ اب جو اندھیرے میں کنڈی چھوتا ہوں تو قفل دبا ہوا ہے۔ اس طبقے
کے لوگوں کو چور اچکوں سے روز ہی سابقہ رہتا ہے، پاؤں سے سر تک ایک
سناٹا ہوا۔ پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ پسینہ آگیا۔ سب چیزیں جہاں جہاں سے اٹھائی
تھیں وہیں پھر جمادیں اور مجبوراً اس کو جگانا چاہا کہ کنجی دو وہ اسوقت تک نشے میں
انٹاغفیل تھی۔ اول اول گر کے کہنے لگی تکیہ کے نیچے ہے اور پھر کروٹ لے کر
خراٹوں کی سادھی۔ ہم نے کہا اس میں کیا گیا۔ محمد علی قسم رسول مقبول کی میں نے
پھر سب چیزیں اٹھائیں بغل میں پاندان ایک ہاتھ میں لوٹا گلاس دوسرے ہاتھ
میں ڈبیا اور کنجی۔ قفل تو کسی نہ کسی طرح میں نے کھول لیا۔ اب جو کنڈی کھولتا
ہوں تو بغل ڈھیلی پڑ گئی کھڑ بڑ کھڑ بڑ کر کے زینے پر پاندان گرا۔ اسی گڑبڑ میں لوٹا
گلاس وغیرہ بھی میں نے پھینک دیا۔ اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ قسم قرآن کی
اسوقت سمجھ میں آیا کہ چوری آسان کام نہیں گلی میں سناٹا تھا۔ میرے پر لگ گئے
تھے مگر قسم امام حسین کی معلوم ہوتا تھا کہ فوج پیچھے دھاوا کرتی چلی آتی ہے ایک

وہی موٹر میں نے پار کی ہوگی اب چال بھی آہستہ کر دی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی چلئے گرما گرم دل پر جیسے موگری سی پڑی آواز تو تھی چائے والے کی مگر قسم خدا کی مجھکو معلوم یہ ہوتا تھا جیسے کوئی کہتا ہے وہ چوٹا جاتا ہے پکڑنا جانے نہ پاوے اگر راستے میں کتا بھی ملتا تھا تو معلوم ہوتا تھا پولیس کے انسپکٹر جنرل ہی آگئے۔ خیر بھئی کسی نہ کسی طرح امین آباد پہنچے قسم کلام پاک کی جو اس اسوقت درست ہوئے۔ باقر چچا نے ٹھیک اندازہ کیا تھا یہ بات میں بھی ہضم نہ کرسکا اور یہ قصہ اچھا خاصہ عام ہو گیا مگر باوجود اس کے لوگوں نے باقر صاحب کے بارے میں رائے وہی رکھی جو ہمیشہ سے تھی اسی اُمید پر یہ قصہ میں بھی لکھ گیا ہوں کہ پڑھنے والے بھی صرف مذاق پر نظر کریں گے اور مرحوم کو وہی چور اچکا نہ سمجھیں گے۔

میرے پڑھنے والے! آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے آپ کو پورا اختیار ہے کہ میرے اور میرے دوست سید محمد باقر مرحوم کے لئے وہی رائے قائم کیجئے جس سے ہم دونوں آدمی سزاوار ہیں مگر پھر بھی میں یہی کہے جاؤنگا کہ میاں باقر چوری کے کبھی قریب نہیں گئے تھے میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اگر آپ باقر مرحوم کو ایسا جانتے ہوتے جیسا میں نے جانا۔ یا میرے قلم میں طاقت ہوتی کہ انکی سچی تصویر آپکے سامنے آجاتی تو آپ بھی میرے ہم خیال ہو جاتے مذاق کی تعریف کی گئی ہے دو غیر چیزوں کو ایک خاص انداز سے ملا دینا۔"

باقر مرحوم میں یہ مادہ اس درجہ تھا کہ جہاں اس کا موقع آجاتا تھا وہاں وہ بے بس ہو جاتے تھے گذشتہ دل قصہ میں غور کیجئے تو باوجود میری کج مج بیانی کے شاید اس بات کا پتہ چل جائے۔ میاں باقر جن کو رنڈی سے کبھی لگاؤ نہیں رہا چوری سے کہیں دور کا بھی واسطہ نہیں باوجود اپنی حرکتوں کے اپنے زعم ناقص میں شریف تھے مذاق کی صورت بندھ جائے تو بے اختیار ہو جاتے تھے ان سب چیزوں کو یکجا کیجیے تو شاید آپ بھی مرحوم اور راقم الحروف کو معاف کر دیں اُن کے سچے محسن اور دلی ہمدردوں کو ان کی اکثر یہ شکایت پیدا ہو جاتی تھی کہ یہ ایک طرف کی بات دوسری طرف لگا دیتے تھے جس کے زیر بار احسان تھے اس کی بھی ہنسی اڑا جاتے تھے، اس طرح کے اور بھی الزامات ان پر لگائے جاتے تھے لیکن ان کے جاننے والے اکثر اس کا تجربہ کرنے بیٹھے ہیں اور یہ بات ہمیشہ ثابت ہو گئی ہے کہ اگر کوئی مذاق کا پہلو نکل آیا تو چاہے تیسری جنگ عظیم ہی کیوں نہ چھڑ جائے میاں باقر راز فاش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس مذاق کے چسکے کے پیچھے جو شخص خود اپنا مضحکہ کروائے اس سے دوسروں کو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

ایک زمانے میں باقر صاحب بہت پریشان ہو گئے تھے ناچار ایک بڑی ریاست میں درخواست دی تھی ان کے بچپن کے ہم مکتب بے تکلف دوست ایک قاضی صاحب وہاں پہلے سے ملازم تھے۔ یہ قاضی صاحب نہایت بیوقوف

مذاق سے ہزاروں کوس دور۔ بانگڑو۔ نیک نیت۔ باوفا قسم کے آدمی تھے کنگڑا بھی تھے۔ جب میاں باقر اُن کو بناتے تھے تو یہ ہاتھ پاؤں سے جواب دیتے تھے۔ اس لیئے میاں باقر اُن کو صرف ایسے وقت میں چھیڑتے تھے جب جان لیتے تھے کہ قاضی صاحب کا دسترس ان تک ممکن نہیں ہے۔ قاضی صاحب رخصت پر آئے میاں باقر نے اپنی درخواست کا حال سنایا قاضی صاحب نے نہایت ہمدردی کا اظہار کیا اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں دفتر میں ایک معمولی جگہ پر ہوں میں تمھاری کیا امداد کر سکتا ہوں لیکن اگر منیجر صاحب کے نام تم ایک درخواست یاددہانی کی مجھکو لکھکر دیدو تو میں وہاں دفتر میں یہ کوشش کر سکتا ہوں کہ وہ درخواست آخری حکم کے لیئے پیش کر دیجائے منظوری نامنظوری تمھاری قسمت کے ہاتھ ہے۔

میر باقر:۔ ہم کو قاضی صاحب آپ سے یہی اُمید ہے تو بھائی صاحب جب واپس جانے لگیں تو میرا خط لیتے جایئے گا بھول لیئے گا نہیں عنایت ہوگی۔

قاضی صاحب: نہیں بھولونگا کیسے اور کسی قابل خدا نے نہیں کیا تو کیا اتنی خدمت بھی دوست کی نہ کرینگے ہم کوئی ہفتے عشرے میں جائیں گے اسوقت خط لیں گے اس گفتگو کے آٹھ دس دن بعد ایک روز میر باقر ہمارے یہاں آئے۔ کہنے لگے اوہ بہت مارا سالے نے قاضی کا ہے کو قسائی ہے قسم کلام مجید کی ہڈیاں توڑ دیں۔

میں :- کہو کیا ہوا۔
میر باقر :- ارے میاں وہی درخواست نوکری کی، جو ہمنے دی تھی نا تمھارے سامنے تو باتیں ہوئی تھیں۔
میں :- ہاں ہاں، تھوڑی دیر ہوئے وہ تو تم کو ڈھونڈھنے یہاں بھی آئے تھے۔
میر باقر :- ہاں ہاں، آیا ہو گا سب کہیں تلاش کرتے کرتے شاہ صاحب کے یہاں پہنچا۔ ہم لوگ کوٹھے پر خوش گپیاں کر رہے تھے نیچے سے میاں باقر میاں باقر کی ہانکیں لگانا شروع کیں۔ میں نے کہا کیا ہے قاضی صاحب کہنے لگے بھئی میں آج دوپہر کی گاڑی سے جاؤں گا۔ ردولی بھر کے صدقے ہو آیا تب تم یہاں ملے ہو وہ خط دیدو تو جو کچھ میرے بس میں ہو گا دفتر میں کوشش کروں گا۔ میں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور خط لکھنے بیٹھ گیا مگر قاضی مردود کا سبز کشمیرے کا دگلہ اور اسکا ٹرک پر سے گردن ٹیڑھی کر کے باتیں کرنا کچھ ایسا تھا کہ میں نے درخواست کی یاددہانی یوں کی۔
جناب میجر صاحب! تسلیم۔ یہ افریقہ کا بوٹ (بروزن نوٹ) حاضر خدمت ہوتا ہے اسوقت میں ایک ضروری کام میں مصروف ہوں لہذا تکلیف کر کے آپ اس کو پانچ جوتے بٹھا دیجیئے۔ مشکور ہوں گا۔
لفافہ بند کر کے میں نے دیدیا اور شکریہ ادا کیا اس نے کہا میاں باقر کیا شرمندہ کرتے ہو اور کسی قابل نہیں تو میں دوست کی اتنی خدمت سے بھی گیا

وہ تو چل کھڑا ہوا تھا مگر یاروں نے اس سے کہدیا کہ قاضی صاحب میاں باقر کا خط ہے کسی اور کا نہیں ذرا پڑھ لیجئے گا تو پیش کیجیئے گا اس نے جو پڑھا تو میاں کوٹھے پر چڑھ آیا کسی اور طرف راستہ نہیں بس اسے پکڑ لیا۔ بہت مار اخیر ہم بھی کسی دن کسر نکال لیں گے جاتے کہاں ہو بچا۔

سید باقر صاحب کے گھن اور ہتھوڑے والے مذاق کا ذکر آپنے سنا بکنے اور ہنسنے کا جس کو عارضہ ہو وہ نظیر اکبر آبادی ہو جائے مگر میر تقی میر کی نزاکتیں ہر جگہ نہیں پیدا کر سکتا۔ لگر ہمارے باقر چچا کبھی کبھی نکچایاں بھی دکھا جاتے تھے۔ ایکدن صبح کو ہم لوگ چائے پی رہے تھے ایک شخص میلا سا منڈاسا باندھے آیا اور کہا کہ ہم جوہری ہیں جوہری کسی طرف سے نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میر باقر صاحب نے اس کو اپنی دُر نجف کی انگوٹھی دکھائی اس نے کہا کوئی اسّی روپیہ رتی کا ہے یہ نہ زمانہ ہے جب ہیرا بھی ہر دوسری چیز کی طرح بامول نہیں تھا جب بلور کو ہیرا بتا گر اسنے اپنی جوہر شناسی ظاہر کر دی تو آپنے دہی مرحومہ دہانِ فرنگ والی انگوٹھی دکھائی۔ اور کہنے لگے دیکھئے اس میں کچھ پشمینے کا میل تو نہیں ہے۔

ایک صاحب پرانے سرے کے چھوٹے تھے لڑکپن میں عادت پڑی اور جوانی میں مضبوط ہو گئی اپنی عادت کے موافق بیان میں کچھ غلطیاں کر گئے جو اسوقت

کھل گئیں ہر شخص نے مختلف انداز سے نفرین کی میاں باقر ہمدردی سے کہنے لگے دیکھو تم جھوٹ نہ بولا کرو نہیں تو تمہاری عادت پڑ جائے گی۔

ایک مرتبہ ایک صاحب لکھنؤ کے ہمارے قصبے میں آئے انکو یہ ناز تھا کہ ہم دیہاتی بولی خوب بولتے ہیں کچھ ذکر اردی کا آگیا جس کو دیہات میں گھیتا کہتے ہیں وہ صاحب اپنا دعویٰ بھول کر پوچھنے لگے گھیتا کیا؟ میر باقر نے انکو بتایا کہ اس کو انکے یہاں اردی کہتے ہیں انکو اپنا دعویٰ یاد آگیا اور کہنے لگے ہاں ہاں میں جانتا ہوں اور اس کو بھاٹا بھی تو کہتے ہیں (بھاٹا دیہات میں بیگن کو کہتے ہیں) بھاٹا کہتے وقت لکھنوی صاحب نے اس لفظ پر اچھا خاصہ زور دیا تھا۔ باقر صاحب کہنے لگے جی ہاں جب غصے میں ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ یہ امین آباد کے ایک بالاخانے پر ایک صاحب کے مہمان تھے اس بالاخانے کے نیچے کی دو کان پر ایک حافظ جی صاحب لال داڑھی لانبا کرتہ ٹوٹی دار پائجامہ مذہبی سنجیدہ آدمی ایک بڑی دوکان رکھتے تھے۔ رات کے وقت کوئی گیارہ کا عمل رہا ہوگا۔ ایک صاحب حافظ جی کی تلاش کرتے آئے انکو خیال تھا کہ اوپر کے حصے میں حافظ صاحب کے علاوہ اور کون ہوگا سڑک پر سے انھوں نے حافظ صاحب کو پکارنا شروع کیا۔ انکی بیتابی بتاتی تھی کہ کوئی بڑی ہنگامہ ہے کیونکہ وہ بار بار پکارتے تھے اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ایک دو منٹ سے زیادہ زحمت نہ دیں گے۔ یہاں بجائے حافظ جی کے جھنگلے سے چارپائی لگائے ہوئے میاں باقر لیٹے تھے

ہر آواز کے ساتھ ان صاحب کی بے تابی بڑھتی جاتی تھی دو چار آوازوں کے بعد یہاں سے نہایت اطمینان کی پتلی آواز اور مدھم سروں میں آئی "دوت" وہ صاحب سمجھے نہیں انھوں نے کہا کیا فرمایا حافظ صاحب۔ یہاں سے پھر مناسب وقفے کے بعد آواز آئی "دوت" اب تو اس شخص نے آواز بھی سُنی اور معنی بھی سمجھا مگر اس کو یقین نہ آیا کہ دوت کہا گیا ہوگا۔ یہاں سے بھی مقررہ وقفے کے بعد وہی "دوت" کہا گیا تعجب کے لہجے میں نیچے سے آواز آئی "ایں یہ کیا" مقررہ وقفے کے بعد ہی اطمینان بھی سنجیدگی سے انھیں مدھم سروں میں "دوت" ارے یہ کیا شرافت ہے "دوت" پھر وہی "دوت" یہ دیکھیے بڑا حافظ بن کے آیا ہے۔ ہاتھ بھر کی داڑھی لٹکائے چوری نکلے ہوئے اور حرکات یہ "دوت" اب تو وہ سڑک پر اینٹیں پتھر تلاش کرنے لگا۔ مگر اول تو سڑک صاف تھی دوسرے ان تک کوئی ڈھیلا پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ "دوت" پھر وہی کمینہ پن کیا پاجی آدمی ہے "دوت" لاحول ولاقوۃ۔ "دوت" وہ جاتے جاتے پھر پلٹ پڑا اور حافظ جی کو گالیاں دینے لگا۔ اب برابر یہی ہوتا ہے کہ وہ حافظ صاحب پر نفریں کرتا ہوا جانا چاہتا ہے مگر "دوت" کی آواز پھر اس کو کھینچ لاتی ہے اور وہ نئی نئی گالیاں حافظ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا جاتا ہے وعدہ تو کر گیا تھا کہ صبح کو وہ اپنے مخاطب یعنی حافظ صاحب قبلہ کی جوتوں سے مدارات کرے گا مگر باقر صاحب صبح منہ اندھیرے ہی کی گاڑی

سے چلے آئے اس وجہ سے پتہ نہ چل سکا کہ ان دونوں میں صحبت کیونکر گرم ہوئی۔ ہمارے قصبے میں کربلا ایک تفریح کی جگہ ہے۔ وہاں بڑی عمدہ عمارتیں امام باڑے مسجدیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جناتوں نے بنوائی ہیں اُن کو دیکھنے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ ایک بار وہاں باہر کے ایک بڑے رئیس نے منّت کی مجلس کی تھی میں بھی مدعو تھا۔ وہاں باقر صاحب پہلے سے موجود تھے کسی کونے میں بھڑوں نے چھتّا لگایا تھا۔ میاں باقر جو اُدپر سے نکلے تو گردن اور کان میں کئی ایک بھڑیں لپٹ گئیں باقر صاحب کو اور کمالات کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ درد کی تاب نہ تھی۔ ذری سی بات میں چیخنا چلانا۔ ہائے ہائے کے نعرے لگانا معمولی بات تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد پاؤں ٹپخنا اُفّوہ اُفّوہ کی جھڑ باندھنا۔ درد کی شکایت ہر شخص سے ہمدردی کی بھیک مانگنا۔ بڑے شدّومد سے ہو رہا تھا۔ اتنے میں دو ایسے باہر کے حضرات کو آتے دیکھا جو ان کے شناسا مگر اس عمارت سے اجنبی تھے یہ لوگ پڑھے لکھے۔ شائستہ شرافت کی تصویر معلوم ہوتے تھے۔ میاں باقر نے جہاد نفس کے جزع افزا ایک دم روک دی اور باوجود تکلیف کی شدت کے چہرہ سنجیدہ کر لیا اور بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ عمارت دکھانے کے بہانے وہیں لے گئے جہاں خود اُن پر مصیبت آگئی تھی۔ میں نے چاہا کہ ان کو آگاہ کر دوں مگر جب تک میں آدمی بھیجوں یا پہنچوں۔ وہاں جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا

سید باقر صاحب تو غائب ہو گئے۔ اب دیکھتا کیا ہوں کہ وہ دونوں آدمی خیالی پٹا بانا ہلاتے مختلف پیترے بدلتے سر و گردن پر تھپڑ مارتے چلے آتے ہیں۔ اور بھڑ رہے ہیں کہ اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اب اس سے اندازہ کر لیجیے کہ باقر مرحوم کو جب کوئی مذاق سوجھ جائے تو دل سے مجبور ہو جاتے تھے۔

مکمل تصویر تو بڑے سے بڑا آرٹسٹ بھی نہیں کھینچ سکتا یہ کام تو فقط احسن الخالقین ہی کا ہے۔ ایک آن۔ ایک وضع ایک جذبہ افتاد طبیعت کا ایک رنگ اگر کوئی اتارنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو وہ اپنے وقت کا رفیل اور ولیسکینز کہلاتا ہے۔ جب اتنے اتنے بڑے صاحبان موقلم کا یہ حال ہو تو ایک چھوٹا آدمی لکڑی لوہے کا قلم ہلانے والا کیا کر سکتا ہے مگر میں نے کوشش کی ہے کہ باوجود تمام باتوں کے ہمارے باقر چچا اس قلمی خاکے میں ایسے معلوم ہوں کہ پڑھنے والا اگر ان سے محبت نہ کرنے لگے تو نفرت بھی نہ کرے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہوا ہوں تو خیر اللہ کا شکر ہے اور اگر اس میں بھی ناکامیاب رہا ہوں تو مرحوم مجھ کو معاف کریں اور خدا مجھے بخشے۔

میر یوسف

میر محمد یوسف غریبی کی گھریا میں تپائے گئے تھے کھرا مال رہ گیا تھا کھوٹا جل گیا تھا لیکن گھریا سے نکل لینے کے بعد سنار کھرے سونے کو بھی سہاگے وغیرہ سے چمکیلا کر لیتے ہیں۔ آدمی میں یہ سہاگہ تعلیم کا ہوتا ہے تنگدستی مفلوک الحالی کی وجہ، وہ سہاگہ ان کو ملا مگر کم..... بچپن ہی میں ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ باپ نے مجبوراً دوسری شادی کر لی تھی ایسے لڑکے کی بد قسمتی بیان کی محتاج نہیں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا اور یہ تھے شروع جوانی میں روٹی کے لئے گھر چھوڑ کر سفر کو جانا پڑا خود فخریہ بیان کرتے تھے کہ میں کلکتہ کو پیدل چلا کچھ پیال بجھانے کو اور جیب میں کچھ پیسے زندگی قائم رکھنے کو کلکتے تقریباً ایک ماہ میں پہونچے وہاں سے بھی بھاگے کرایہ کہاں تھا جہاز پہ کوئلہ جھونکنے یا پلیٹ وغیرہ دھونے کا کچھ کام کر کے رنگون پہونچے۔ بیان کرتے تھے کہ دن کو اینٹیں پاتھنے کا کام کرتے تھے۔ تیسرے پہر کو ایک برف والے کا سامان سڑک کے کنارے لگاتے تھے، میز برف کا صندوق سوڈا واٹر کی بوتلیں اور گیارہ بجے رات کو پھر اس کے گھر یہ سب چیزیں پہنچاتے تھے۔ جب کچھ روپیہ ہو گیا گھر لوٹ آئے مگر غریبی نے دامن نہ چھوڑا قصہ مختصر غریبی وفادار عورت کی طرح عمر بھر گلے کا ہار رہی۔ یہ بیوفائی

پر ہمیشہ تلے رہتے تھے مگر اس نے ان کو نہ چھوڑا۔
مستقل نوکری کبھی نصیب نہ ہوئی مگر بیکار کبھی نہیں رہے زیادہ تر پیمائش میں جایا کئے شادی بھی ہو گئی تھی غریبی اور برخورداری بچے بھی بہت سے پیدا ہو گئے۔ ایک بار اوڑیسہ میں تھے بیمار پڑ گئے گھر پریشانی سے خط بھیجا کہ کرایہ بھیج دو۔ بیوی نے گروی گانٹھ کر کے دس روپئے بھیجے منی آرڈر میں دو ٹکڑے دس روپئے کے نوٹ کے ملے اس زمانے میں نوٹ کے آدھے کرنا خلاف قانون نہ تھا اب جو گھر میں آکر دیکھتے ہیں تو دونوں ٹکڑے مختلف نوٹوں کے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر کے پاس گئے خوشامد کرنے لگے کہ منشی جی ہم غریب آدمی ہیں بیمار ہیں ہم مر جائیں گے۔ للہ یہ واپس لے لیجئے ہم کو دوسرا نوٹ دیدیجئے پوسٹ ماسٹر صاحب بہادر کبھی یہ غلطی کر گئے تھے اور یقیناً سرکاری روپیہ ان کو بھرنا پڑا ہوگا اس کے بعد سے انھوں نے اس ذریعہ سے نہ معلوم کتنا کما لیا تھا۔ اکثر جاہلوں کو یہی ٹکڑے دیدیتے تھے اور جب وہ واپس لاتے تھے تو دو روپیہ دو روپیہ کم پر معاملہ کر کے اپنا گذشتہ نقصان روز کے منافع سے بدلا کرتے تھے میر یوسف نے عسرت بیماری غریب الوطنی بے یاری و مددگاری کے نہ معلوم کتنے سفارشی پوسٹ ماسٹر صاحب کے سامنے پیش کئے مگر وہاں شنوائی نہ ہوئی۔ اور دو روپیہ انھوں نے لے ہی لئے۔ دو ٹکڑے واپس لئے میر صاحب بچارے پوسٹ آفس کے احاطے کے باہر ٹہلا

کئے جب پوسٹ ماسٹر صاحب دفتر بند کر کے باہر نکلے تو میر صاحب نے موصوف کو بلا تکلف اُٹھا کر دے مارا اور چھاتی پر چڑھ بیٹھے اور نہایت لجاجت سے اپنے مصائب ہرانے لگے۔ یہ بھی عرض کر دیا کہ غریبی نے جان لینے اور جان دینے دونوں کا ڈر دل سے دور کر دیا ہے اپنی تنہائی کا دکھڑا رونے میں یہ بھی کہا کہ آپ حاکم بالادست سرکاری ملازم ہیں۔ اگر آپ کے طرفدار لوگ چھوڑانا چاہیں گے تو فوراً میں آپ کا گلوئے مبارک جس پر میں احتیاطاً ہاتھ رکھے ہوں فوراً گھونٹ دوں گا میر صاحب کا حلیہ بھی کچھ ایسا تھا کہ اس طرح کی باتوں کی اُمید میر صاحب سے کی جا سکتی تھی نیچے کا جبڑا چوڑا۔ ارادے کی مضبوطی بتاتا تھا بڑی بڑی آنکھیں ایسے موقعے پر پھیل کر اور بڑی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ آخر کلام میں ہونٹ مضبوطی سے بند کر کے دہانہ اور چوڑا کر لیتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر بہادر کے دو چار ہمدرد جمع ہو گئے مگر اس الٹی میٹم کے بعد ہاتھ کسی نے نہیں لگایا بلکہ یہی صلاح ٹھہری کہ پوسٹ ماسٹر صاحب میر یوسف کی غریبی پر رحم کر کے معاملہ طے کر لیں لوگ وطن سے دور جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہاں کے واقعات بیان کرنے میں ذرہ ہی طلسم ہوش رُبا کا رنگ پکڑ لیتے ہیں مگر میر صاحب کے بیان کے پہلے دو دوسرے گواہوں نے مجھ سے یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا تھا اس لئے میر صاحب پر مبالغے کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی ارادے کی مضبوطی

کی تصدیق مجھ سے زیادہ کوئی نہ کر سکے گا کیونکہ جب میرا علاقہ کورٹ سے چھوٹا تو میر صاحب نے ارادہ مضبوط کر لیا کہ میرے یہاں مختاری کرینگے میں نے ہزار ہاتھ پاؤں مارے بہت سمجھایا کہ میر صاحب آپ کے اور ہمارے برادری کے مراسم جھگڑے میں پڑ جائیں گے مگر پوسٹ ماسٹر صاحب کی طرح مجبور ہو گیا اور میر صاحب مرحوم کا ارادہ ایسا کامیاب ہوا کہ درمیان میں سوا ایک تھوڑے سے دم لینے کے وقفے کے یہ رشتہ صرف میر صاحب کی موت توڑ سکی۔ مختاری کا شوق کافی تھا مگر قانون سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی سُنا کرتے تھے کہ مختار لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ بیال کے پاؤں ایسے کھڑے کر دیتے ہیں کہ عدالت سچ مُچ کر سمجھنے لگتی ہے۔ ڈھول کی رسی بٹ کر تیار کر دیتے ہیں مگر خود کبھی ان باتوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ ان کے محلے میں ایک مسماۃ کا انتقال ہو گیا وہ کچھ صاحب جائداد تھیں۔ چند فخر لعین النسل کمینہ خصلت بیکار لونڈوں نے یہ تجویز کیا کہ مسماۃ کا جعلی وصیت نامہ تیار کیا جائے۔ شامت کے مارے ادھر سے میر یوسف آ رہے تھے محلے کا معاملہ ہر شخص سے جان پہچان لونڈوں نے کہا خوب آ گئے ذری بتائیے تو کس طرح یہ مسودہ لکھا جائے ان کو خود کوئی منفعت کی اُمید نہ تھی۔ صرف مختاری اور قانون دانی اور ایک مشکل کام میں کمال دکھلانے کو بیٹھ گئے مسودے

ہیں کہیں کہیں اپنے قلم سے بھی اصلاح دی بعد کو جب لوگ پکڑے جانے لگے تو محلے بھر میں اَمَّن یُجِیبُ المُضطر اذا دعاہ و یکشف السوء کی دھوم مچی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے دو چار لاکھ مرتبہ تو میر یوسف بھی ٹرھ گئے ہونگے خیر آپس کی بات تھی کسی نہ کسی طرح معاملہ دب گیا لیکن اللہ میاں کی دُنیا کچھ اس بات کے کہنے والے اور صرف اسکے پڑھنے والوں سے تو تیار نہیں ہوا کرتی۔ یہاں تو ہزاروں لاکھوں طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک صاحب بھتے (انکی روح نہ رنجے) جن کا قاعدہ تھا کہ دوستی ہمدردی کے پیرائے میں وہ اگر کسی کو ذلیل کر سکنے کا موقع پا جاتے تھے تو پھر کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ظاہر ہے کہ میر یوسف کا یہ فعل کوئی قابل تحسین تو تھا نہیں لیکن جن لوگوں کے دلمیں انکی جگہ تھی اُنھوں نے اس بنا پر معاف کر دیا کہ کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو تو اس قسم کی حرکت حماقت کی حد سے باہر نہیں جاتی۔ مگران صاحب کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا۔ یہاں دو چار آدمیوں کے بیچ میں میر یوسف کو دیکھا کہنے لگے کیوں جی یوسف پہونچ گئے اپنی سزا کو نا۔ اب پھر جعل بناؤ گے پہلے تو میر یوسف اظہار ندامت کے ساتھ ساتھ ان کی بے تکلفانہ ہمدردی کو بھی سراہا کئے لیکن جب یہ بات اور بڑھی اور ایک اچھے خاصے مجمع میں انھوں نے پھر یہی کہا تو میر یوسف نے اپنی آنکھیں پھیلائیں اور ارادے کی مضبوطی والے جبڑے کا ٹھاٹھ

بدلا سینہ تانا گردن اونچی کی تاکہ محفل بھر اُن کی آواز اچھی طرح سن سکے اور فرمانے لگے بس صرف ایک مرتبہ جبل اور بناؤں گا جب تم مروگے تو تمھارا وصیت نامہ تیار کروں گا ایسے موقعوں پر میر صاحب چوڑے جبڑے کو اور چوڑا کر لیتے تھے۔ دونوں ہاتھ خم کر کے نیچے کمر پر جما لیتے تھے جیسے وہ چشمی آنکھوں کو پھیلا کر جتنی حوتق بنا سکتے تھے بنا لیتے تھے اس کے بعد اعلان جنگ فرماتے تھے اور اعلان جنگ کے بعد سر کو دو تین بار اس طرح جنبش دیتے تھے جیسے ٹھڈی سے سینے کی ہڈی چھونا چاہتے ہیں۔ گویا ارادے پر تصمیم کی مہر لگاتے تھے جب جملہ پورا کر لیتے تو اپنے ہونٹھ دبا کر دہانا اور چوڑا کر لیتے تھے گویا زبانِ حال سے فرماتے تھے، کہ اب تو میرے کہنے میں تم کو کوئی شک نہ رہا ہوگا۔

ظاہر ہے کہ یہ مضمون نہ میر یوسف کی تعریف کا قصیدہ ہے نہ ہجو لکھی جاتی ہے یہ تو ایک خاکہ ہے جس سے اگر میر صاحب مرحوم کی ایک دھندلی سی تصویر کھینچ جائے تو میں کامیاب ہوا نہیں تو۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

میرے پڑھنے والو جب ہمارے آپ ایسے اچھے آدمیوں میں کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈھنے سے نکل آئے گا تو اگر میر یوسف میں کوئی کمی رہی ہو تو کیا تعجب ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں بچپن میں انھوں نے بڑی تکلیف اُٹھائی تھی پیش از وقت روٹی کی فکر نے انکے اوپر دوامی اثر ڈالا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا

تھا کہ بچوں کے پیٹ پالنے میں نہ خودداری باقی رہی تھی نہ ایسی حرکتوں سے شرماتے تھے۔ جو شخص دوسروں کے لئے ایسی محنت مزدوری کرے۔ یا دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے میں اپنے آرام کا خیال نہ رکھے اپنی تکلیفوں سے نہ گھبرائے۔ بچوں کے اوپر اپنی خودی کو نچھاور کر دے اُس کی بُرائی کس مُنھ سے کی جائے۔ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں روپیہ کم چل رہا تھا ضلعدار کے کام کو دیکھنے کے لئے یہ بھیجے گئے۔ خیر کام تو جیسا دیکھا ویسا دیکھا ہی لوٹتیوں کو گھر کے لئے جھاڑو باندھے چلے آتے تھے ظاہر ہے کہ جو شخص حلقے کے ضلعدار کے اوپر تعینات کیا جائے وہ وہاں سے جھاڑو بغل میں دبائے واپس آئے اس کا رعب بھی تو کچھ ہلکا ہی پھلکا ہوگا جوانی میں بڑے جفاکش تھے بڑھاپے میں بلغم بڑھ جانے کی وجہ سے اوپر کی منزل بھاری ہوگئی تھی اور نیچے کی منزل یعنی پاؤں کو زیادہ محنت پڑتی تھی اسلئے چلتے پھرتے ذری تکلیف سے تھے مگر فرض منصبی ادا کرنے میں ہمت سے سب کچھ کر لیتے تھے۔ میر صاحب غصّہ کبھی کبھی تو دکھا دیتے ہی تھے لیکن اصل صفت اُن کی انکسار تھی بڑے منکسر مزاج کام میں کبھی عذر نہیں بعض باتوں میں تصنّع کی جھلک بھی پائی جاتی تھی مثلاً مجلس عزا میں روتے بڑے زور سے تھے مشاعرے یا قصیدہ خوانی کی محفلوں میں تعریفیں بھی مبالغے سے کرتے تھے چاہے اس میں

سخن فہمی کی ٹھیک ہی نکل جائے۔ اپنے بچوں پر خفا ہوتے اور اگر کبھی گھر میں کسی پر خفا بھی ہوتے تھے تو لوگوں کو تصنع کا پتا چل جاتا تھا اس دوسری قسم کی غصے کی تصویر کھینچنا میرے امکان سے باہر ہے۔ بھلے کو ایک مثال مل گئی ہے اس سے شاید پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے۔

اخبار میں اشتہار نکلا کہ ایک سنیما کمپنی میں ایکٹر اور ایکٹرسوں کی ضرورت ہے انکے لڑکے نے اپنی خدمات پیش کیں وہاں سے جواب آیا کہ ہم تم کو ضرور رکھ لیں گے بشرطیکہ تم اپنے ساتھ ایک ایکٹریس بھی لاؤ۔ مجبوراً انھوں نے اپنی بے بسی ظاہر کی مگر یہ لکھا کہ اگر کہیئے تو اپنے والد ماجد مدظلہ کو لیتا آؤں غصے کا پارٹ موصوف اچھا کر لیتے ہیں جیسا کہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں یہ تھوڑے دن کے لیئے میرے یہاں سے چلے گئے تھے مگر مختارنامہ منسوخ نہیں کرایا گیا تھا اور ایک دوسری عقل سے دور جہالت سے قریب ریاست میں مختار ہو گئے تھے وہاں میر صاحب مرحوم نے اچھا خاصہ کمایا۔ ہمارے ملک میں اوپر کی آمدنی علیحدہ مد ہے کسی سے پوچھیئے کیا تنخواہ ہے۔ وہ بتاتا ہے اسقدر ہے پھر پوچھیئے اوپر کی آمدنی وہ کہتا ہے جی ہاں کچھ ملجاتا ہے۔ شکر ہے اللہ کا اودھ میں ریاستوں کے مختاروں کی ایک برادری قائم ہو گئی ہے جن کے اصول اخلاق بھی بن گئے ہیں اکثروں کا خیال ہے کہ شاعر کی طرح مختار بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ مقدمہ بازی کا شوق اللہ میاں کے یہاں سے لاتے ہیں اور

اسی فطری تقاضے پر مختاری کو دوسری نوکریوں پر ترجیح دیتے ہیں یہ لوگ اپنے مالکوں کو لوٹنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں لیکن مدمقابل کا احسان لینا یا اُس سے ملجانا ان کے مذہب میں جائز نہیں میں ایک ریاست کے مختار کو جانتا ہوں جن کو فریق ثانی نے رشوت دیکر ملا لینا چاہا۔ اس نے نہایت حقارت سے کہا کہ لوٹنے اور نفع کمانے کے لئے خود ہماری ریاست کیا کم ہے۔ جو ہم غیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت قبول کریں۔ ہم حساب میں ایک کے دس لکھتے ہیں۔ اور پا جاتے ہیں ہم شریف ہیں مدمقابل سے ملجانا وہی کر سکتا ہے جس کے نطفے میں فرق ہو جہاں یہ رنگ ہو وہاں اگر میر صاحب مرحوم نے کچھ جمع کر لیا ہو تو کون ان ہونی بات کی۔ البتہ ایک آدھ لغزش ایسی کر گذرے جس سے انکے نئے آقا پر تو ان کا رعب یا مگر دوسرے انکو پہچان گئے۔ یہ ریاست جس ضلع میں تھی وہاں کے حاکم ضلع میرے بے تکلف جاننے والے تھے میر یوسف حاکم ضلع کے سلام کو گئے ہمارے یہاں کسی حاکم سے گھر پہ ملنے کی نوبت اُن کو کبھی نہیں آئی تھی اس نئی ملازمت میں اپنے آقائے ولی نعمت کو مرعوب کرنے کے لئے اور ریاست میں اپنا رنگ جمانے کو یہ بھی کر گذرے وہاں اُنھوں نے کہا کہ چونکہ اس ریاست کا انتظام بہت خراب تھا اور مالک ریاست نے میرے رئیس سے (یعنی اس حقیر سے) ایک منتظم مانگا تھا لہذا میں بھیجا گیا ہوں کہ ہر چیز درست

ہو جائے بد قسمتی سے وہ میرے لا ابالی پن اور سٹر ٹیر کام سے اچھی طرح واقف تھے اسلئے آتشبازی چھینک گئی اور وہ سمجھ گئے اینتھ راجا یتھ پر جا میر صاحب بھی کچھ ایسے ہی ویسے ہونگے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں زمینداروں کو ایک نئی مشکل سے سامنا کرنا پڑا تھا وہ یہ کہ گاؤں سے جتنے رنگروٹ بھرتی ہو کر فوج میں جاتے تھے وہ وہاں سب سے پہلا کام یہ کرتے تھے کہ اپنے زمینداروں اور دوسروں کی شکایتوں کے خطوط اپنی فوج کے کرنل کے ذریعہ سے بھجواتے تھے۔ اور سول حکام ان کی چھان بین کرتے تھے چنانچہ اس طرح کی کچھ درخواستیں ہمارے اوپر بھی گذری تھیں لیکن یکے بعد دیگرے سب خارج ہو جاتیں چنانچہ کسی مقدمے میں میر صاحب میرے پیروکار تھے ڈپٹی صاحب تھے تو نئے مگر تجربہ کار اچھے خاصے تھے۔ علاوہ قانونی کارروائی کے دھونس ڈالکر بہت سا عدالتی کام کم کر لیتے تھے صلح کرا دینا مستغیث یا مدعی سے زور ڈالکر عرضی دعوے یا استغاثہ واپس کروا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا چنانچہ عدالتی کارروائی کے درمیان میں ان کو کسی فوجی آدمی کی درخواست یاد آگئی یہ مقدمہ چھوڑ کر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔

ڈپٹی:۔ کیوں جی مختار تمہاری ریاست کے خلاف ایک درخواست تو پہلے ہی سے تھی اب ایک اور آئی ہے میں کہتا ہوں کون جیلخانے جائے گا۔ بتاؤ جیلخانے کون جائیگا۔ فوجیوں کی درخواست بالا بالا جانے والی نہیں ہے۔

اس میں کوئی نہ کوئی تو ضرور جیلخانے جائے گا۔ بتاؤ کون جیلخانے جائے گا۔
میر صاحب: پیچھے سے بڑھ کر وکیل کے برابر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔
میر یوسف: جیلخانے جائیں گے یا مالک یا ست یا ڈپٹی کلکٹر۔ ہم نوکر آدمی
ہم سے آپ کیا پوچھتے ہیں۔

ڈپٹی صاحب بیچارے بنیئے آدمی تھے پھر مقدمہ کرنے لگے ایک بار میر صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اسی ریل پر میں بھی تھا مگر ان سے علیحدہ تھا لکھنؤ کے اسٹیشن پر ریل کا ایک آدمی مجھ سے آ کر کہنے لگا کہ تمہارے ملازم سے اور ایک انگریز سے لڑائی ہو رہی ہے میں چلا گیا کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے۔ دیکھا کہ ڈبے میں کئی آدمی ہیں اور ایک بنچ کے بیچوں بیچ میں میر صاحب بیٹھے ہیں اور سامنے کے بنچ کے کونے پر ایک انگریز بیٹھا ہے میں نے کہا میر صاحب خیریت ہے کہنے لگے آپ جانئے سب خیریت ہے میں نے کہا ڈنڈا ونڈا ہے کہنے لگے جی ہاں ڈنڈا سا ہے اور (مد مقابل کی طرف دیکھ کر) اور چکو بھی ہے یہ کہتے وقت میر صاحب کی وہی آنکھیں وہی ٹھڈی وہی ہونٹھ اور وہی گردن کی جنبش اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے۔ ستر سال کے اُدھر رہے ہونگے کہ کل عید ہے آج درزی کے یہاں اپنے پوتوں کے کپڑوں کے لیے گئے تھے کہ عید کے پہلے مل جائیں۔ وہیں قلب کا دورہ ہوا اور گھڑی بھر میں ختم ہو گئے لوگ کہتے ہیں آخر وقت اپنے عقائد بیان کرتے جاتے تھے اور یہ پوچھتے جاتے تھے کہ صحیح الفاظ منھ سے نکل رہے ہیں نا۔

نفاست

مرزا صاحب نے بڑی عمر پائی۔ ۹۰ برس کے سن میں ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ انتقال کیا ہے۔ مرنے کے دو چار دن پہلے تک وہی انداز رہا جو ہم لوگ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے تھے۔ کچھ انگریزی سے بھی واقف تھے نہیں معلوم نوابی میں کس سے پڑھی تھی۔ نئی باتوں میں تو حافظہ ضرور کمزور ہو گیا تھا مگر پرانی باتیں اُسی طرح یاد تھیں۔ اور اس وضاحت سے بیان کرتے تھے کہ تصویر کھنچ جاتی تھی۔ الفاظ منھ سے نکلتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ تختے پر خود قلم کام کر رہا ہے خوش بیانی کی تعریف نہیں ہو سکتی منہ سے پھول جھڑتے تھے جی یہی چاہتا تھا کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی"۔ بچہ ہو جوان ہو۔ بوڑھا ہو۔ عورت مرد سب یہی چاہتے تھے کہ مرزا صاحب باتیں کئے جائیں۔ ملبا انگلستان کی کامیکو یورپ کی مشہور گانے والی کے نام سے کسی نے اپنی تصنیف کو یوں عنوان دیا تھا۔ "اُس بلبل غریب کے نام جو ملبا کو سُنکر چپ ہو گئی" بس مرزا صاحب جب باتیں کرتے تھے تو اُسی بلبل کی طرح سب چپ ہو جاتے تھے۔ احباب میں سے کسی نے شعر پڑھا ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اس شعر کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں کہ مرزا صاحب آگئے حسب عادت ہم لوگ اپنے خیالات چھوڑ کر مرزا صاحب کی باتیں سننے کے مشتاق ہوئے۔ اور شعر پھر سے پڑھا گیا۔ مرزا صاحب "شعر کے اچھے ہونے میں کلام کیا ہے مگر مجھ کو ایک واقعہ یاد آگیا ساٹھ برس سے اوپر کی بات ہوگی۔ نوابی جا چکی تھی مگر نوابی کی بو ویسی ہی باقی تھی۔ ناچ گانے کے جاننے والے اور پہچاننے والے جب گھروں کے اندر بیٹھتے تھے تو بھول جاتے تھے کہ دنیا بدل گئی ہے۔

کتھکوں کا ایک خاندان شجاع الدولہ بہادر کے وقت سے لکھنؤ میں آکر بسا تھا ہر صاحب کمال قدردان کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ بھی اس شہر پر جان فدا کئے ہوئے تھے۔ اور یہیں کے نام سے بکتے تھے اس خاندان نے ناچ میں لکھنؤ کا نام اونچا کر دیا تھا۔ لکھنؤ نے بھی ان کے ساتھ یہ کیا تھا کہ پرانی مثل یعنی "کتھکوں کی بسا ہند نہیں جاتی" ان کے لئے غلط ٹھہرا دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہانتک ترہنگ کا تعلق تھا یہ عیب اُن میں نام کو نہیں رہ گیا تھا۔ دوسرے خالص ناچوں کا حال جو جانتے ہوں وہ جانیں۔ ناچ علم سینہ بھی ہے اور علم سفینہ بھی جس کو جسقدر پہونچا ہے سامنے رکھدے اور دامن جھاڑ کر ہٹ آوے۔ اس امانت میں خیانت کی گنجائش نہیں۔ دوسرے جیز بھاؤ بتانا ہے اُس

میں ہر شخص کی ذہانت اور جودت اس کے ساتھ ہے اُستاد کا کام صرف راہیں دکھا دینا ہے۔ آگے تم جانو تمھارا کام۔ ذہن رسا جہاں تک لیجائے بڑھتے جاؤ۔ مگر یہ تکمیل ایسا نازک ہے کہ جس میں اچھائی بُرائی کے مدارج نہیں قائم کئے جا سکتے۔ اگر اچھا ہے تو بھاؤ ہے اور اگر بھونڈا ہے تو کوئی دوسری بلا ہے۔ بات شیطان کی آنت ہو گئی مگر آپ لوگ میری بکواس سنتے ہیں اسلئے اگر کہئے تو بھاؤ بتانے کی ایک مثال بھی دیتا چلوں۔ ہم لوگ "ضرور ضرور مرزا صاحب"۔ بہت خوب۔ میر مونس کے پڑوس میں ایک بھانڈ رہتا تھا۔ بچپن میں دونوں ساتھ کھیلے تھے۔ بڑھکر دونوں کی راہیں جدا ہو گئی تھیں مگر رشتہ باقی تھا۔ ایک مرتبہ اُس بھانڈ کو ایک مشکل آن پڑی مشکل یہ تھی کہ کوری گگریا بتانا تھا مگر ذہن وہاں تک نہیں پہونچ رہا تھا۔ موقعہ پا کر میر مونس مرحوم کے پاس آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا ایک کام ہے اگر کر دینے کا وعدہ کیجئے تو کہوں۔ کہو تو۔ نہیں وعدہ کر لیجئے۔ وعدہ کیسے کر لیں۔ اگر امکان میں ہوا تو کریں گے۔ آہستہ سے کوری گگریا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے بتاؤں۔ ہائیں۔ لاحول ولا قوۃ میں کیا جانوں۔ بھانڈ (پاؤں کا پنجہ پکڑ کر)۔ حضور میں تو یہ قدم نہ چھوڑونگا بچپن سے جوتیاں سیدھی کی ہیں اسی دن کے لئے۔ اگر آپ نے نہ بتایا تو میں جان دیدونگا۔ میر صاحب (سنجیدہ ہو کر) کنواڑ بند کر دو۔ مونس صاحب

نے بائیں ہاتھ کی پانچوں اُنگلیاں اوپر کیں جیسے پھول کی آدھی سے ایک ذرا زیادہ کھلی ہوئی کلی ہوتی ہے ہاتھ چہرے کے برابر اور سامنے لائے داہنے ہاتھ سے ڈھیلی مٹھی باندھی اور بیچ کی انگلی کو سیدھی کرکے آدھی. اس طرح خم کی کہ بیچ کا پور دوسرے پوروں سے آگے نکلا رہا اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ بلندی پر خیالی گگریا کو ٹھنکا مار دیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بھاؤ بتانے میں صرف ذاتی ذہانت ہی سے کام نہیں لینا پڑتا بلکہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کے سامنے کمال دکھایا جا رہا ہے۔ انھیں کتھکوں میں کا ایک فنکار رعالیقدر والاجاہ نواب وزیر مرزا بہادر جو لکھنی والے "کدر پیا" کے سامنے مُجرا کر رہا تھا۔ جوانی کا عالم تھا جوہر شناس کا سامنا تھا۔ جان توڑ کر اپنے کمالات دکھائے اصطلاحوں میں باتیں ہوئیں۔ انکسار کے ساتھ داد چاہی۔ فراخدلی سے حوصلہ افزائی کی گئی ناچ کے بعد بھاؤ بتانے کا وقت آیا۔ گانے کی چیز کوئی ہو فنکار نہ معلوم کتنی خوبصورتیاں نکال لیتا ہے کتنی جدتیں پیدا کر لیتا ہے۔ رسوفیٹ کے لئے کسی نے کہا ہے کہ اگر وہ جھاڑو کی سوانحعمری لکھنے بیٹھتے تو وہ بھی دلآویز ہوتی۔ یہی حال بھاؤ بتانے والے کا ہے کہ اگر لطافت رکھتا ہو تو کیسی ہی بھدی چیز ہو۔ خوبصورت سے خوبصورت تصویریں دکھاتا چلا جائے گا، چیز جو اُس نے شروع کی آپ کے شعر سے ملتی

جاتی تھی" وہیں جاؤ جہاں رہے رتیاں" کس طرح ابیسار دکھایا۔ مان دکھایا۔ برہا۔ کا خاکہ اتارا اور نہ معلوم کتنے پہلو، گوشے پیش نظر کر دیئے آخر میں ایک پاؤں ڈگ گیا۔ کی کرائی محنت پر پانی پھر گیا موقع یہ تھا اب مکر و نہیں۔ تمھارے کپڑوں کی خوشبو سے یہ ثابت ہے کہ تم سوت کے یہاں تھے۔ دیکھو تمھارے لباس میں کون عطر ہے اور تمھاری بغل سے کس زمانے عطر کی لپٹیں آ رہی ہیں معشوق کو بغل سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے مگر بغل سے مطلب پہلو ہے اور کتھک نے غضب کیا کہ واقعی بغل کی طرف اشارہ کیا بس غضب ہو گیا۔ حضور کی لطافت طبع نزاکت مزاج کو ایسی ٹھیس لگی کہ منھ پھیر لیا۔ ہے ہے بدمزاقی کی انتہا کر دی اگر بات دکھانی تھی تو پہلے آستینیں سونگھتا پھر دامن سونگھتا دونوں میں مختلف خوشبوئیں کہاں سے آئیں "وہیں جاؤ جہاں رہے رتیاں" مطلب حاصل تھا۔

جاگتی تصویریں

چودہ[14] پندرہ[15] برس ہوئے اکیڈمی آف آرٹ لندن میں ایک تصویر کی بڑی دھومیں تھیں۔ تصویر کا نام تھا لُبھانے کی راہیں، تختے پر پانچ چھ کمسن لڑکے تھے اور ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ یہ سب پیرو اور پیرٹ تھے جو تماشے میں ہنسی مذاق کا پارٹ کرتے ہیں۔ حسب قاعدہ اُنکے چہرے سفید رنگے ہوئے تھے اور کپڑے بھی سفید تھے۔ سب کے سب لڑکی کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ایک لڑکا اُس کے پاس بیٹھا ہوا بڑے وثوق سے اُس کو تِتّی لگی مٹھائی دے رہا ہے گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ لو کھاؤ، ہم تو ایک ہیں ہی میں اور میرا اپنا اور سب رونا۔ ایک دوسرے صاحبزادے ایک چھڑی لئے اس کے گال کا نشانہ لگا رہے ہیں گویا کونچ ہی دیں گے۔ اُن کا فلسفہ ہے کہ ہنسی تو پھنسی اور یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس طرح وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی تو پالا یارون ہی کے ہاتھ رہیگا ایک تیسرے صاحب کپڑوں کی شکنیں دور کئے ہوئے ایک خاص آن سے علیحدہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور اپنی دلآویزی بڑھا رہے ہیں۔ بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں کیسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں" یہ اپنے زعم ناقص میں سمجھے ہوئے ہیں کہ جہاں اُنھوں نے یہ ٹھاٹھ بدلے بس

عورت زال کی طرح جگمگ ہی تو پڑے گی ۔ اپنی آنکھ کی موہنی کے خود دل سے قائل ہیں چاہے کسی اور کو دکھائی دیتی ہو یا نہیں ۔ ایک اور صاحب ہیں ۔ اُنھوں نے تو غضب ہی ڈھایا ہے ۔ مغموم ، مہجور ، اور چہرہ اداس نیناں بان کے گھائل ، دل بکھرے ۔ کونے کے اندھیرے میں بیٹھے ہیں ۔ گویا فرما رہے ہیں اپنی بپتا میں کاسے کہوں ۔ تمرے کارن جو دکھ پائے ۔ ہم لوگ اس تصویر کو دیکھ ہی رہے تھے ۔ اتنے میں مرزا صاحب آ گئے ۔ فرمانے لگے ۔ ارے میاں تم کاغذ پر دیکھ رہے ہو ۔ ہم نے یہی تماشہ جیتے جاگتے انسانوں کا ان آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ یاد ہے وہ سال جب فلاں نیم قومی نیم مذہبی جلسہ ہمارے لکھنؤ میں ہوا تھا ۔ فلاں والئی ملک شریک ہوئے تھے بھئی وہ اجلاس بھی یاد رہیگا ۔ ڈائس پر کا سماں آج بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے ۔ جلسہ بیچ ادھڑ میں تھا کہ سواری کی آمد آمد معلوم ہوئی جس طرح طوفان کے پہلے سکون ہوتا ہے اُسی طرح پورا جلسہ ساکن ، مگر حرکت کے لیئے تیار ۔ جیسے بھڑوں کا چھتہ اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی اس کے قریب آتا ہے ۔ اتنے میں تشریف آ ہی گئی ۔ اللہ اللہ وہ جوش وہ نعرہائے درود ۔ پورے جلسہ نے سروقد تعظیم کی ۔ اس کے بعد پھر کارروائی شروع ہوئی ہم کو کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا ۔ ہم تو چند حضرات ابوالخیرات کے دیکھنے میں ایسا محو ہوئے کہ جلسے کو بھول ہی گئے ۔ ایک صاحب کا چہرۂ مبارک

ہنستا پھول، ہنستی کلی۔ کرسی پر متمکن مگر سر اور سینہ ایسا آگے کو جھکائے تھے گویا جو کچھ اوپر سے ٹپکیگا یہی تو گویا چُن لینگے۔ ایک دوسرے بزرگوار استغنا کی تصویر توکل کی نظیر بے نظیر اس طرح تشریف فرما تھے گویا الدنیا جیفۃ و طالبہا کلاب کا ورد فرما رہے تھے مگر باوجود اس کے ہر بن مو سے ٹپکا پڑتا تھا کہ بزم عشاق میں کیا جانے کدھر دیکھیں گے۔ دل یہ دیتا ہے گواہی کہ ادھر دیکھیں گے تیسرے صاحب انکسار و خاکساری کا مجسم زبانِ حال سے بہ نہد شاخ پر میوہ سر بر زمین فرمائے تھے۔ اور مہمانِ والا شان کی میزبانی کے تمام مراحل بے منت و بے سوال و بے استحقاق طے کرنے پر تُلے تھے۔ چوتھے بزرگوار دولت علم و ایمان میں سرشار ظاہراً دنیا اور اہل دنیا سے بے پروا مگر باطنا پورے جلسہ سے خبردار جمعیت کا ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اُنھیں میں ایک ... بندۂ خدا ایسا بھی تھا جو انانیت سے الگ اپنے کھلے ڈلے انداز سے خیر الامور اوسطہا کی تفسیر فرما رہا تھا۔ تصنع سے دور وہ توازن قائم کئے ہوئے تھا جس کو دیکھ کر انسان کی اشرفیت سمجھ میں آجاتی تھی۔

مینر وکرزم

اودھ کے ایک جنوبی ضلع میں مشاعرہ ہو رہا تھا مصرع طرح پر "برق سی ایک چمک گئی آج سرِ نیاز میں" اکثر شعرا کی تضمینیں تھیں پر سب سے بہتر غزل میں مصرع طرح پر مصرع لگایا گیا تھا۔

اس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقش پا کہوں؛ برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

لوگوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے ہمارے مرزا صاحب نے صرف ایک واہ پر اکتفا کی۔ اس کے بعد ایک اور تضمین پڑھی گئی وو ٹیپ جو اُس نے جھاڑ دی گس کے وفور ناز میں۔ "برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں" مذاق کے اشعار کی تعریف سہل ہوتی ہے نقادی کی غلطیاں ہنسی میں ٹل جاتی ہیں۔ بڑا قہقہہ پڑا۔ بڑی تعریفیں ہوئیں مگر مرزا صاحب نے ایسی سنجیدگی سے داد دی کہ شعر کی اصلی وقعت لوگوں پر کھل گئی۔ اور احباب خاص سمجھ گئے کہ مرزا صاحب بعد کو اس شعر پر کچھ اظہار خیالات کرینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا دوسرے تیسرے دن جب ہم لوگوں کی صحبت گرم ہوئی تو میں نے ذکر چھیڑا۔ مرزا صاحب نے کہا۔ دو جنسی بیماریاں ہوتی ہیں جن کو سیڈزم اور میزوکزم کہتے ہیں۔ سیڈزم میں مار کر اور میزوکزم میں پٹ کر خالی لطف ہی نہیں آتا بلکہ اندرونی اعضا کا تناؤ بھی کم ہو جاتا ہے اور تسکین بھی ہوتی ہے۔

مشاعرے سے واپسی پر ٹیپ والا شعر میرے ذہن پر برابر چھایا رہا۔ مجھ کو ایک واقعہ بھی یاد آگیا جو کہانی کی صورت میں کہا جا سکتا ہے۔ اگر کسی صاحب کا دل چاہے تو اس کو لکھ سکتے ہیں ہیولاک ایلس کے یہاں قصہ کی ہر ہر بات موجود ہے اور بیسوں طرح سے ظاہر ہوئی ہے اور اس طرح کی مثالیں روز دیکھنے میں بھی آتی ہیں۔ حضرات قصہ ذرا لمبا ہے۔ اگلے زمانے میں لوگ دوستی میں تلواریں کھاتے تھے۔ زخم اٹھاتے تھے۔ اب تو یہ ہے کہ ہم بکواس کریں اور آپ نہایت صبر و تحمل سے اُس کو سنیئے"۔ میں۔ مرزا صاحب! معاف کیجیئگا۔ آفتاب کے داغوں کی طرح آپ میں بھی تو ایک عیب ہے کہ بلا وجہ انکسار شروع کر دیتے ہیں اجی حضرت اسی واسطے تو آپکو چھیڑا ہے۔ مرزا صاحب بہت خوب سنیئے۔ ہمارے مکتب کے مولوی صاحب کی دو خصوصیتیں قصبہ میں مشہور ہیں بڑوں میں تو یہ انکے شاگرد دنیا میں ناکامیاب نہیں رہتے۔ اور لڑکوں میں یہ کہ بڑے قصائی قسم کا مولوی ہے واقعی انھوں نے جہاں نیچے کا ہونٹ دبا کر کچی داڑھی کھڑی کی بس قیامت آگئی۔ مولوی صاحب کی دو چیزیں منجھی ہوئی تھیں ایک تو ہاتھ بید دوسرے قمچی سے۔ جب ہاتھوں سے مارتے تھے تو صرف گالوں پر آفت آتی تھی۔ جب قمچی چلتی تھی تو چوتڑوں پر۔ مولوی صاحب کی قمچی یا ہاتھ جب اپنا کام کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ مینھ برس رہا ہے۔ بٹیر بازوں کی اصطلاح میں ایک ٹیر ہوتا ہے جو کرفو۔ مینھ کا کہلاتا ہے اسیطرح مولوی صاحب کی ضربوں میں بھی ایک خاص قسم

کی کڑواہٹ تھی۔ یعنی وہ جگہ جہاں چوٹیں پڑتی تھیں سُن ہو جاتی تھی۔ یہ بات ہاتھوں سے کم اور قمچی سے زیادہ ہوتی تھی مگر تھی دونوں میں۔ تھپّڑوں میں تو لڑکا مبہوت ہو کر رہ جاتا تھا مگر قمچیوں میں ایک عجیب بات تھی یعنی دو چار ہاتھوں کے بعد جسم سُن ہو جاتا تھا۔ پھر ایک قسم کا حظ پیدا ہوتا تھا۔ یہ بات میں نے خود محسوس کی اور دوسروں سے بھی پتہ چلا۔ قمچی کی مار میں پہلے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اُس کے بعد ایک خاص قسم کا مزا پیدا ہو جاتا تھا۔ اُس کے دو چار گھنٹوں کے بعد جو تکلیف شروع ہوتی تھی وہ دیر تک قائم رہتی تھی مگر عجیب بات تھی کہ لڑکے آپس میں اس حظ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اُن کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی دلی کیفیتوں سے واقف ہیں مگر ہمدردی کا موقع نہ سمجھتے تھے میرے خیال میں اُنکی حالت کچھ ان بیاہی عورتوں سے ملتی جلتی تھی جو اُن کی کسی نئی دلہن سے ملکر ہوتی ہوگی۔ یہ خیالات مولوی صاحب مرحوم کے ایک شاگرد کے دل میں کیوں آئے۔ اس وجہ سے کہ مولوی صاحب کی مار میں کچھ جنسی لگاؤ ضرور تھا۔ ایام بچپن میں یہ بات اُن کے شاگردوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ مگر دُنیا دیکھنے کے بعد اب سمجھ میں آئی ہے۔ ہمارے ایک ہم سبق تھے جو بعد کو پولیس انسپکٹر ہو گئے تھے اور بہت دن پنشن کھا کر ابھی ابھی مرے ہیں۔ گو کہ مرحوم انسپکٹر اس جوار میں نہیں رہے۔ پھر بھی اُن کے کارنمایاں ڈاکوؤں کے پکڑنے اور اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے آج تک مشہور ہیں۔ پولیس

کا سب سے بڑا بادشاہی تمغہ ان کو ملا تھا اور خاص نشین باقی تھی۔ ملازم کیا کیجیگا پوچھ کر۔ شاید آپ حضرات میں سے کوئی جانتا بھی ہو تو کیا فائدہ۔ میرے خیال میں مولویصاحب کی مار کا اثر عمر بھر رہا آپ کہیں گے کہ دوسروں پر وہی اثر کیوں نہ ہوا۔ اس کا جواب میرے پاس صرف یہ ہے کہ نزلے کی ہوا چلتی ہے موسم کا تغیر و تبدل ہوتا ہے لیکن سب پر ایک طرح کا اثر دکھائی نہیں دیتا کسی کو زکام بھی نہیں ہوتا کسی کو زکام سے کھانسی کسی کو نمونیا ہو جاتا ہے۔ نمونیا کے بعد کسی کے آگے نزلہ زکام ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں کسی کو دمہ ہو جاتا ہے اور کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ تحریک بھی ہوئی تھی۔ شیلی کے طالب علمی کے زمانہ میں انگلستان میں بھی یہی فلسفہ تھا کہ لڑکے کو اگر تباہ کرنا ہو تو مولویصاحب بھی گھر دھر آدیں۔ اسی ایٹن میں نازک اندام شیلی پر جو مار پڑ چکی ہے وہ ضرب المثل ہے شیلی کے زندگی کے جو خاص پہلو ہوئے وہ بھی آپ سے چھپے نہیں ہیں۔ ایٹن کے ڈاکٹر کیٹس اُمرا کے لڑکوں کو مار مار کر فرنچ ریولیوشن کے اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ جھوٹ بولو کوئی نقصان نہیں ہے بد عقیدہ ہو کوئی ہرج نہیں لیکن منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلنے پائے جس میں جھوٹ یا لامذہبی کا انداز کھل جائے۔ سچے دلی خیالات کوئی پا جائے۔ فٹ بال ہاکی میں ٹانگ ٹوٹ جائے کوئی ہرج نہیں ہے باکسنگ میں کوئی لڑکا مر بھی جائے تو کچھ پرواہ نہیں ہے مگر انگلستان کے اُمرا سے اُن کی خصوصیات نہ چھوٹیں ہمارے انسپکٹر

صاحب نے اُسی مارے، دوسرے اثرات قبول کئے اُن کا ڈیل ڈول مکتب میں
سب سے زیادہ تھا۔ پڑھنے میں تو ایسے ہی ویسے تھے مگر کبڈی وغیرہ میں کوئی انکا
مقابل نہ تھا۔ جوان ہونے پر چھ فٹ دو انچ کا قد بیالیس انچ کا سینہ کوئی
کہاں سے لاتا جو اُن سے ٹکر لیتا۔ رنگ کالا تھا۔ ماں باپ نے سیپ کا دُر کان میں
ڈالدیا تھا۔ اسلئے ہم لوگ اُن کو موتی گج کہتے تھے۔ بعد کو اُن کی شادی ایک
خوبصورت لڑکی سے ہوئی تھی۔ کامنی عورت کی تعریف کتابوں میں سُنی
تھی مگر دیکھا انسپکٹر ہی کی بی بی کو۔ صورت شکل مزاج، چال ڈھال کہاں تک بیان
کروں بس یہ سمجھ لیجئے کہ خوبصورت سے خوبصورت عورت اُسی وقت تک خوبصورت
معلوم ہوتی تھی جب تک رباب محفل میں نہ ہوں۔ لے لیجئے میں نام بھی لے گیا۔
خیر ہوگا۔ مگر ہمارے انسپکٹر صاحب کافر نعمت تھے جیسے سوکھے ساون ویسے
ہرے بھادوں۔ اُن کے منھ سے کبھی اُس غریب کا ذکر نہ سُنا۔ اُن کو اپنے کار منصبی
اور کشتی لڑنے سے فرصت نہ تھی، جو اُس غریب کو پوچھتے۔ ورزش بھی اُن کی
کچھ نرالی ہی تھی۔ ہاتھ پاؤں کو دیکھتے ڈنڈ کم لگاتے۔ مگدر کا صرف یکہ ہلاتے
تھے جس میں نمائش زیادہ اور فائدہ کم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسکی یہ وجہ رہی ہو
کہ اُن کی جوڑ کا دوسرا پہلوان نہیں تھا یا اُن کو اپنی قدرتی طاقت پر اتنا
بھروسہ تھا کہ زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ کشتی کا انداز
متھرا کے چوبوں کا تھا۔ جیسے بھاری جوڑوں میں ہوتا ہے جلت پھرت کم

جہاں انسپکٹر صاحب نے زمین پکڑی پھر کیا مجال کہ کوئی ہمسا یکے گھنٹہ دو گھنٹہ خوب گدّے کھائے۔ مخالف نے خوب گھسّے بتائے۔ اسکے بعد نیچے سے نکلے تو مقابل کو آسمان دکھا کر اکھاڑے سے نکل آئے۔ اکثر تو یہ ہوتا تھا کہ دو دو ٹھیوں کو ساتھ زور دلوا دیا کشتی خوبصورت نہ سہی کثرت تو ہو گئی۔ ہمارے انسپکٹر عورتوں سے متنفر نہ تھے کیونکہ ناچ مجرے کے جلسوں میں انکو کافی دلچسپی ہوتی تھی۔ اور باوجود پہلوان ہونے کے صنف نازک کے قدردان سمجھے جاتے تھے۔ مگر نہ جانے بی بی سے کیوں لطف نہ تھا ایسی بی بی جس کا میاں اُس کو نہ چاہتا ہو اوروں کی نظر میں نہیں آتی اسیوجہ سے انکی بی بی بھی باوجود خوبصورتی کے کسی خاص گنتی شمار میں نہ تھی۔ ایک معتدبہ زمانے کے بعد غریب کا انتقال ہو گیا۔ انسپکٹر صاحب نے جب اُس نعمت کی قدر پہلے نہیں کی تو اب زوال کے بعد کیا کرتے۔ پنشن کا وقت بھی قریب آگیا تھا کسرتی بدن پہلے بھی خوبصورت نہ تھا اب تو گوشت بھی ڈھیلا ہو چلا تھا۔ اور توند بھی نکل آئی تھی مگر ٹھیوں کو زور دلانا اور کشتی کو پرانے انداز میں جاری رکھنا اب بھی چلا جاتا تھا۔ اُن کے تبادلے مختلف مقامات پر ہوا کئے لیکن اُن کی کشتی اور ہماری دوستی کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری زمانہ ملازمت میں مجھ کو وہاں جانیکا پھر اتفاق ہوا جہاں انسپکٹر صاحب تعینات تھے۔ گو کہ خوش تھے مگر تنہائی کی شکایت کرتے تھے۔ اپنے قیام کے زمانہ میں مجھے ایک نئی بات

دکھائی دی یعنی انسپکٹر صاحب کو مچھلیاں کھانے کا شوق ہوگیا ہے اور ایک مچھلی والی کوئی ۳۵ برس کا سن سانولی رنگت۔ گداز ہاتھ پاؤں لمبی تڑنگی عورت صبح کو مچھلیاں دے جاتی ہے۔ گھر میں اس کا آنا جانا۔ مچھلیاں باورچی خانہ میں رکھنا۔ اور عموماً سودے والیوں سے زیادہ بے تکلفی برتنا کچھ غیر معمولی سا معلوم ہوا۔ میں نے مذاق میں پوچھ ہی لیا۔ ارے میاں بڑی کرط دی ہے اُدھر نہال بھی نہ لے جانا۔ دیکھ رک کر، بھئی مرزا تم ہمارے پرانے یار ہو۔ تم سے پورا واقعہ بیان کئے دیتا ہوں جس دن پہلے پہل یہ مچھلیاں بیچنے آئی ہیں بنگلہ کے سائبان میں بیٹھا تھا۔ نوکر کہیں گیا تھا میں نے مچھلیاں خریدیں اور یہ وہیں بیٹھ کر بنانے لگی۔ مجھ کو نہ معلوم شیطان نے کیا انگلی دکھائی کہ میں نے کہا مکھیاں بہت ہیں چلو اندر چلکر بناؤ یہ بے تکلف اندر چلی آئی اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی میں نے صدر دروازے میں کنڈی لگا دی تب بھی یہ خبردار نہ ہوئی اب مسکراتا ہوا قریب آکر بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ بڑھایا تب تو یہ شیرنی مچھلی کاٹنے کی بنی لے کر کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ اگر یہ کردگے تو مارتی ہوں۔ آنتیں ڈھیر ہو جاویں گی۔ بھتیا میرے حواس پیترا ہو گئے میں نے دروازہ کھولدیا اور کھسیانے پن سے اُس کو اطمینان دلایا تب سے یہ ہو گیا ہے کہ یہ روز آکر مچھلیاں دے جاتی ہے اور اگر ضرورت ہو تو بازار کا سودا سلف بھی کر دیتی ہے۔ ایک دن باورچی بیمار پڑ گیا تھا تو ایک وقت کا کھانا بھی

بغیر میرے کہے پکا گئی تھی مگر تب سے پھر اس طرح کی کوئی بات کرنے کا ہواؤ نہ بندھا۔ ہمارے دوست یہ باتیں کر رہے تھے اور میرا دل نہ معلوم کیوں مولوی صاحب کی مار۔ اکھاڑے کی رگڑ تگڑ اور چھلی والی کا اپنا اوزار سے کھڑی ہو جانا ایک ہی سلسلہ میں گوندھتا ہی رہا۔ اس واقعہ کے دو ہی برس کے بعد انسپکٹر صاحب کی پنشن ہو گئی مگر وہ وطن نہ آئے بلکہ سُنا گیا کہ وہیں کہیں بازار میں ایک مکان لے لیا ہے۔ اور اُسی چھلی والی سے نکاح پڑھوا لیا ہے۔ پھر میرا اتفاق اُس ضلع میں جانے کا ہوا ان باتوں کے سُننے کے بعد میرا پاؤں انسپکٹر صاحب کے مکان کی طرف نہ اُٹھا۔ اور میں ایک وکیل دوست کے یہاں ٹھہر گیا۔ باتوں باتوں میں میں نے انسپکٹر صاحب کا حال پوچھا۔ وکیل صاحب ''ارے صاحب اُن کی تو عجیب حالت ہو گئی ہے۔ ایسی کایا پلٹ تو دیکھی ہی نہیں۔ پڑھے لکھوں کی صحبت تو اُن کی کبھی تھی نہیں وہی پہلوان وغیرہ اُن کے یہاں آتے جاتے تھے۔ مگر اب تو نہ معلوم کیسی مت پلٹی ہے۔ کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بازار میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا ہے اب وہ ہیں اور چھلی والی۔ نہایت گندی گلی ہے مگر وہ مگن ہیں سُنا جاتا ہے کہ سماۃ نشے میں مرمت بھی کرتی ہیں۔ گالم گلوج تو اڑوس پڑوس والے ہر وقت سُنا کرتے ہیں۔ مگر انسپکٹر صاحب۔ ہم تم راضی تو کیا کرے قاضی ان واقعات کو سننے کے بعد دل میں کچھ ایسی گدگدی اُٹھی کہ میں ٹہلتا ہوا

وہاں پہونچ ہی گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ انسپکٹر صاحب برآمدے میں ایک کھری چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور ایک سٹریل حقہ پی رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اصرار کرنے لگے کہ یہیں ٹھہرو۔ اُن کی مسماۃ بھی کوٹھری سے نکل آئیں اور اس اصرار میں شریک ہوگئیں۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ پرانا یار اور اتنے دنوں کے مراسم کچھ کہتے نہیں بنتا تھا نہ معلوم کیا ہوا کہ میں نے ہامی بھر لی۔ انسپکٹر صاحب جلدی سے اُٹھے اور سڑک پر اتر کر پاس کے بنیئے کو پکارا۔ ارے لالہ ذرا اس کمرے کی کنجی تو دینا ہمارے ایک دوست آگئے ہیں۔ کنجی لے کر درمیان کی کوٹھری سے ملا ہوا کمرہ کھولدیا۔ درمیانی کوٹھری سے ایک دروازہ اس میں کھلتا تھا۔

انسپکٹر صاحب۔ مرزا صاحب۔ یہ کمرہ اسی واسطے ہے یہ اسی مکان سے متعلق ہے مگر ہم لوگوں کو کیا کرنا ہے اس طرح کرایہ بھی کم ہوگیا اور جب ضرورت ہوتی ہے کھلوا بھی لیتے ہیں۔ اکیلا کمرہ کون لیتا۔ خالی ہی تو پڑا رہتا تھا جو مکانیت انسپکٹر صاحب کے قبضہ میں تھی اس میں صرف دو کوٹھریاں اور اس کے آگے ایک برآمدہ پشت پر ایک چھوٹی سی انگنائی اور پاخانہ اسکے سامنے کوٹھری کے اندر ایک چھپر پڑا تھا جو باورچی خانے کا کام دیتا تھا اللہ اللہ خیر صلاح ایک کوٹھری میں گھر کا سامان تھا۔ دوسری کوٹھری انسپکٹر صاحب کا استراحت خانہ۔ بڈروم جو سمجھئے۔ ان کی بی بی نے کھانا تیار کیا تامچینی کی کوری پلیٹوں یا پیالوں

میں کھانا آیا۔ ہم لوگ کھا کر حقہ پی پی کر سونے چلے گئے۔ رات کو دو تین کا عمل رہا ہوگا کہ میری آنکھ کھل گئی میرے کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ کیونکہ مجھ کو اندھیرے میں سونے کی عادت ہے انسپکٹر صاحب کی کوٹھری میں روشنی تھی اور کچھ عجیب طرح کی آوازیں آرہی تھیں جو فوراً جاگنے کے بعد اور زیادہ بھیانک معلوم ہو رہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی کراہ رہا ہے۔ اس طرح کے موقعوں پر مختلف آوازیں سنکر بجائے پریشان ہونے کے ہنسی آنا چاہیئے۔ مگر کچھ اور آوازیں تھیں جن سے میری پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ نہ معلوم کون کون فاسد خیالات دماغ میں آگئے۔ ایک آواز تو ایسی تھی جیسے کوئی تھپڑ مار رہا ہے دوسری آواز تھی جیسے کوئی لاٹھی کا ہولا ہار ہار زمین پر مار رہا ہے مجھے تاب نہ رہی میں نے دراڑ سے دیکھ ہی لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب زمین پر چیانی بچھائے لیٹے ہیں۔ اور مچھلی والی ان کے سینے پر کھڑی انکو روند رہی ہے اور دونوں ہاتھوں میں دو لاٹھیاں پکڑے ہے کہ انسپکٹر صاحب سے پھسل نہ جائے جب پیٹ کی طرف سے بڑھتی ہوئی سینے پر پہونچتی ہے تو لاٹھی پر زور دیکر باری باری ایک ایک پاؤں اٹھا کر پنجے اور تلوؤں سے انسپکٹر صاحب کے منھ اور سر پر تماچے مارتی ہے۔ دونوں آدمی اس حالت میں ہیں جیسے دنیا میں آئے تھے عورت کی دھڑکتی دھمک، چال سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ بھی کچھ لطف اندوز ہو رہی ہے یا نہیں۔ مگر انسپکٹر

صاحب مزے میں آ کر اس کے پاؤں کی لے پر دونوں ہاتھوں سے چٹکیاں بجا رہے تھے کالی اور مہا کالا کا شاکتی ناچ معہ سب سامان کے ہو رہا تھا۔ اس ناچ کی پانچوں ضروری چیزیں مہیا تھیں۔ مے تھنا، مدرا مچھلی والی کی طرف سے مدرا انسپکٹر صاحب کے اُٹھے ہاتھوں کو سمجھ لیجئے۔ رہے ماس اور مچھلی۔ جہاں دو اتنے تن و توش کے آدمی موجود ہوں وہاں گوشت کی کیا کمی مچھلی والی مچھلی کی کمی کو پورا کر رہی تھی۔

ایک عمدہ کتاب

سرِ رضا علی کی کتاب اعمال نامہ پڑھی جا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ سرسری تنقید بھی ہوتی جاتی تھی۔

ایک دوست :۔"بھئی مجھ کو جو بات اس دال روٹی پوس کاٹ میں سب سے زیادہ پسند آئی وہ سچائی کی کھنک ہے۔ بے چارے نے اپنے دل کے دونوں کنواڑ کھول کر رکھ دیئے ہیں کہ جو کچھ ہے دیکھ لو۔ کوئی پردہ نہیں ہے"۔

دوسرے دوست :۔ اب چاہے دال روٹی پوس کاٹ کہہ کر ہنسئے چاہے اس کی صاف دلی کی داد دیجئے۔

تیسرے دوست :۔ دل کے دونوں کنواڑ کھول کر لکھ دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے اس کی کوشش کی ہے کامیاب بھی ہوئے یا نہیں، یہ ذرا غور کے قابل ہے۔ اگر یہ فرمائیے کہ زبان خوب کمائی ہوئی ہے تو میں ماننے کو تیار ہوں اگر یہ کہیئے کہ اُنھوں نے تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے تو یہ بھی درست ہے لیکن پوری بات کہہ جانا کارے دارد۔

دوسرے دوست :۔ میں مطلب نہیں سمجھا۔ بیچارے نے اپنے خانگی معاملات ساس بہو کی اَن بن تک کہہ گذاری ہے۔ پھر اور کیا کرتا۔ بڑے بڑے بزرگوں

کی خامیاں، کمزوریاں نہایت صفائی سے بیان کر دی ہیں اور کیا چاہیے۔

تیسرے دوست :۔ ہاں ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ انھوں نے بھرپور اس کی کوشش کی ہے مگر ہر شخص رد سو نہیں ہو سکتا۔ آپ تہذیب کا بھی دامن چھوڑ دینگے قانونی گرفت بھی نہ آنے دیں گے۔ بزرگوں کی وکالت بھی کرتے جائیں گے اور سچائی کو بھی لئے رہنے کی کوشش کریں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے کہ کہیں نہ کہیں ٹھوکر دھری ہے۔ غریب نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیئے نہ معلوم کتنے قصے عشق عاشقی کے بیان کر ڈالے ہیں کہ انسان کے مبارک گناہ یعنی اس کی جنسی لغزشوں سے سب کو بچا لیا ہے حضرت آدم و حوا کے پہلے گناہ سے ایسے ڈرے ہوئے ہیں کہ عملاً سب کچھ کر دینگے مگر منہ سے نہ کہیں گے۔ اس طرح کی باتوں سے اور صداقت سے جس سے انسانیت پر روشنی پڑتی ہے کوسوں کی دوری ہے اگر آپ کہیں کہ ہندو مسلمان اختلاف کی تاریخ اچھی بیان کی ہے اردو ہندی کے جھگڑے کا بھانڈا خوب پھوڑا تو میں بھی تسلیم کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ کیونکر مان لوں کہ کسی کو خفا بھی نہ کیجیئے گا قدیم تہذیب کے خلاف باتیں بھی نہ کہیئے گا اور پھر سچائی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیجیئے گا۔ تو یہ کیسے بنے گی۔ آپکی جتنی ہیروئنیں ہیں سب کی سب گنواری بیٹھی رہیں گی آپکے جتنے ہیرو ہیں وہ سب بسم اللہ کے گنبد کے پلے ہونگے اور پھر بھی زندگی ویسے ہی اصلی دکھائی دے گی جیسی کہ ہوتی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

دوسرے دوست :۔ (ذرا گرمی کے ساتھ) کیا آپ کا مطلب ہے کہ

سر رضا علی نثر میں وہ کھلی ڈلی حماقتیں کرتے جن کی اجازت صرف نظم اور بند ادین کی ٹھمریوں میں ہے۔

تیسرے دوست:۔ (خفیف سی اونچی آواز میں) نظم اور بند ادین کی ٹھمریاں تو میں جانتا نہیں لیکن حد سے زیادہ تہذیب برتنے میں کھیل بنتا ہی نہیں محسن الملک مرحوم کا حال لیجئے۔ مرحوم کا قصہ تو الگ ہا خود ڈپٹی نذیر احمد صاحب والے اس چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ جتنی نیکٹ لی اور درگذرے سر رضا علی اپنے میں ظاہر کر رہے ہیں یہ فطرت میں بھی ہے یا نہیں۔ جو پھس پھسی ......؟ عشق و محبت کی کہانیاں انھوں نے لکھی ہیں آیا دنیا میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے یا کہیں انسانیت جوش جذبات سے دب بھی جاتی ہے۔

پہلے دوست:۔ جناب مرزا صاحب آپ کچھ نہیں بولتے۔

مرزا صاحب:۔ جی سن رہا ہوں۔ ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

تیسرے دوست:۔ ہاں مرزا صاحب۔ آپ فرمائیں ہم لوگوں کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ فیصلہ آپ ہی کے ہاتھ ہے۔

دوسرے دوست:۔ مجھ کو کوئی عذر نہیں لیکن دونوں فریق کو جو کچھ کہنا ہے۔ وہ پہلے سن لیں اسکے بعد حکم سنا دیں۔

مرزا صاحب:۔ فیصلے دوسرے کرتے ہوں گے میں تو اقبال جرم کرتا ہوں۔ سزا آپ حضرات خود تجویز کریں۔ (پہلے دوست کی طرف مخاطب ہو کر) اس

دُنیا میں بے عیب کون ہے جب ہمارے آپ کے ایسے لوگ اتفاق سے غلطی کر جاتے ہیں تو بے چارے سر رضا علی کی کتاب میں خامیاں ہوئیں تو کیا تعجب ہے لیکن بحیثیت مجموعی کتاب خوب ہے۔ پالیٹکس اُن کا کام ہے وہ بہت اچھا کیا ہے، احباب کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس میں احباب سے زیادہ خود اُن کی نیک دلی اور اجلی رُوح کا پتا چلتا ہے۔ آدمی یقیناً دل پھینک قسم کے واقع ہوئے ہیں اور اُن لوگوں میں معلوم ہوتے ہیں جو کر گذریں گے مگر کہہ نہ سکیں گے۔ بقول سعدی کے "جوانی میں اپنے ہمنشیں جیسی پڑتی ہے تو بھی جانتا ہے" معلوم ہوتا ہے کہ ؎

اُنھیں بھی آتشِ الفت جلا چکی اکبر
حرام ہو گئی دوزخ کی نار اُن پر بھی

مگر ساٹھ سے اُوپر کے آدمی ہیں۔ بے چارے صاف گوئی کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔

دوسرے دوست :۔ بزرگوں میں تو آپ بھی ہیں۔

مرزا صاحب :۔ اجی ہم سینگ کٹا کر بچھڑوں میں داخل ہوئے ہیں ہمارا کیا کہنا۔ کتاب کی تنقید آپ حضرات کریں۔ ہم تو صرف اپنی تنقید کرتے ہیں جس میں بحیثیت انسان کے ہمارا آپ کا، سر رضا علی اور انڈور اڈنگٹن سب کا حال ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی سُن لے گا۔ "کوئی سمجھ جائے گا"، "کوئی غیر مہذب ٹھہرا دیگا"۔ اس لیئے تصویر ادھوری چھوڑ دی۔ اجی حضرت مہر سے لے کر

سعدی گئے اور مرزا محمد ہادی رسوا کی پیروی میں اگر ہم وکٹورین نجابت سے ٹھاٹ باہر کر دیئے جائیں گے تو ٹھینگے سے۔ لیجئے آپ بیتی سنئے۔ مگر پہلے ذرا کچھ گذارش کر لوں ہم آپ کی نئی نئی باتوں پر نہیں ہنستے۔ آپ ہماری پرانی باتوں پر کیوں ہنسئے۔ آدمی کی فطرت نہ بدل گئی ہے اور نہ آئندہ ہی اس کے خدانخواستہ فرشتہ ہو جانے کا ڈر ہے۔ پھر یہ نوجوانوں کا برتری کا گھمنڈ کس لئے بر زمانے کے ساتھ کچھ ردو بدل ہو جاتا ہے کچھ انداز میں فرق آجاتا ہے بس لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اپنے پہلے والوں سے اچھے ہو گئے۔ ہم نے ترقی کرلی۔ مجھ کو جو بات اب نوجوانوں میں بھاتی ہے وہ یہی بھولا پن ہے جنسی ہی معاملات کو لیجئے وہی عشق و محبت کی کہانیاں ہیں۔ وہی دماغ کی بے بسی وہی دل کی حکمرانیاں ہیں اگلے لوگ رنڈیاں نوکر رکھتے تھے اب گھر گرستوں کا راج ہے پہلے پیشہ ور تھے اب دل بہلاؤ کے لئے اپنی خوش باش ہیں رنڈیوں کی لڑکیاں برابر اپنے پیشے کے لئے تیار کی جاتی تھیں۔ جو اپنے کام کی اونچ نیچ سے واقف ہوتی تھیں۔ اُن کے سر پر اُن کے بزرگ ہوتے تھے جو بے راہ چال سے اُن کو روکے رہتے تھے۔ اب "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" اب جس چھوکری کو دیکھئے بن ٹھن کا نتھر جانے بل میں ہاتھ ڈالنے پر تلی ہے کہیں خود کشیاں ہیں کہیں بدنامیاں ہیں۔ کاٹا اور لے دوڑی اور چیز ہے۔ کرنے کی دِدیا اور ہے۔ اچھا تو اب قصہ سنئے۔ ہمارے مکتب میں ایک رئیس زادے تھے۔ جو سِن میں ہم سب سے بڑے تھے۔

قریب قریب باپ بیٹے کا فرق رہا ہوگا۔ اُنکی تعلیم ہم سے دس گیارہ برس پہلے ختم ہوئی تھی۔ مگر بے چارے ایسے اچھے آدمی تھے کہ بزرگی کا خیال نہیں کرتے تھے اور ہم کو باوجود عمر کے فرق کے اپنی بے تکلف صحبت میں داخل کئے ہوئے تھے اُن کے پاس ایک نئی رنڈی نوکر ہوئی۔ نہایت خوبصورت۔ بڑی خوش مزاج اور اُس فلسفہ کی قائل تھی جس کا پہلا کلیہ یہ ہے کہ جوانی پھر لوٹ کر نہیں آتی ہمارے دوست کا جوبن رہا ہو۔ ہم کوئی اٹھارہ انیس کے تھے۔ رنڈی کا سن ہمارے اور اُن کے درمیان میں توازن قائم کئے تھا جس کے پاس بہر حال جوانی اور تجربہ دونوں تھے۔ ہم لوگ گنجیفہ کھیل رہے تھے مگر عجیب اتفاق کہ سوائے ہمارے دوست کے اور کسی سے کھیل بن ہی نہیں رہا تھا اُس رنڈی کے ایکلو سوخت ہو گئے۔ اور ہم پہلا اُلٹا دوسرا سر دینا بھول گئے اور پھر بجائے سوختی ہونے کے ہنسی برابر چلی آرہی ہے جیسے زمین و آسمان کے بیچ میں گدگدی ہی گدگدی بھری ہو۔ ہمارے دوست اُلجھ کر رہتے ہیں کبھی پتے بھی پھینک دیتے کہ اس کھیلنے سے کیا فائدہ مگر ہم نے سنجیدگی کا وعدہ کیا اور پھر وہی کیا ہم ناکتخدا پچھیرے ایک نیا لطف محسوس کرتے تھے مگر یہ لطف کس حد سے تھا یہ نہ سمجھ میں آتا تھا۔ نہ اس کے سمجھنے کا خیال ہی ہوتا تھا۔ معلوم نہیں اُن دونوں کے دلوں میں کیا لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس رنڈی کی دل آویزی ہمارے دل میں جگہ قرار کرتی چلی جاتی تھی۔ جنسی خیالات بھی اُبلے پڑتے تھے مگر ان خیالات کو عملی جامہ بھی کس طرح پہنایا جا سکتا ہے اس کی بابت کوئی امید افزا یا مایوس کن منصوبے نا تجربہ کاری

کی بنا پر دل میں آہی نہیں رہے تھے۔ جو کچھ تھا وہ ہی کیا کم مزے کا تھا۔ جو اور زیادہ کی ہوس ہوتی۔ کیونکہ غریب آدمی کی دولت ناواقف کاری ہی میں ہے۔ اب برسوں کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے تجربہ کار دوست کیوں الجھ رہے تھے۔ اور آزمودہ کار سپاہی کی طرح وہ رنڈی کیوں نہایت اطمینان سے کھیل رہی تھی۔ اور ہنس بھی رہی تھی۔ عورت اس قسم کے ہر نئے موقع پر مرد سے کیونکر اپنے کو زیادہ نڈر دیئے رہتی ہے اور کیونکر زیادہ نڈری سے کام کرتی ہے اس کو عورت کے نفسیات جاننے والے سمجھیں یا وہ سپاہی جو میدان میں صرف مورچہ ہی نہیں سر کر چکا ہے بلکہ شکست اٹھانے پر بھی جی نہیں ہار رہا ہے۔ اسکے بعد کئی موقعوں پر ہم تینوں کا ساتھ رہا ہے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے کوئی بات یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوئی۔ اور نہ کوئی خاص یگانگی ہی بڑھی۔ اس واقعہ کو دو تین ہفتے ہوگئے اور ہم اپنی اس مختصر سی کائنات عیش و رنگ ہی کو بہت سمجھا کئے۔ کہ اتنے میں ایک تار ملا۔ آٹھ بجے شام کی گاڑی پر ہم سے ملو۔ بھتیجی ۔ یہ تو خوب ہوا! بھلے کو رات کے آٹھ بجے گاڑی آتی ہے اگر دن کے آٹھ بجے گاڑی آتی تو بڑی گڑبڑ ہوتی۔ دیکھیں یار ملاقات میں کوئی دقت تو نہیں پڑتی اور اگر اسٹیشن پر کوئی بزرگوں میں سے مل گیا تو کیا کریں گے! اُدھر ہوگا، کوئی دیکھ ہی لیگا تو کیا کرے گا۔ اور ہم اس سے کچھ تعلق کرنے تھوڑی ہی جا رہے ہیں۔ خالی ملاقات میں کیا ہرج ہے۔

ایک ساتھ کھیلے ہوئے رازدار نوکر کو ساتھ لے کر اسٹیشن پہونچے۔ نوکر سے مشورہ کرنے لگے۔ سنو جی۔ اسٹیشن پر آٹھ بجے آنے والی گاڑی کا میل اُدھر سے آنیوالی

گاڑی سے اگلے اسٹیشن پر ہو گا۔ اگر موقعہ ہوا تو ہم وہاں تک چلے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ۳۵ منٹ میں واپس آجائینگے۔ تم اسٹیشن ہی پر موجود رہنا ہاں اور سُن لو جب ہم اشارہ کریں گے تب تم ٹکٹ لینا گاڑی آئی بہت ہی خوشی تھوڑی وحشت سے ملاقات کی۔ پہلے کو درجہ بالکل خالی تھا اور سردی کی وجہ سے جھلملیاں چڑھی ہوئی تھیں یہ اچھا ہوا۔

اگلے اسٹیشن تک چلیے ساتھ رہیگا۔ شروع شروع کی کم ہمتی میدان خالی پاکر کُھل کھیلی۔ اکیلے پن کو فطرت نے راہ دکھائی۔ پھر بھی جو کمی رہ گئی وہ اُستاد نے بتادی۔ دبی ہوئی تھی گر پر صفت خواہش گناہ چکار نے سے پھول گئی شیر ہوگئی۔

بھئی اہاہا زندگی میں آنے بڑے بڑے راز نہیاں تھے۔ اور ہم آجتک بے خبر بے خبر اب سے آگے گذر ہے آگے کیسا اگلا اسٹیشن اور کیسا پچھلا اسٹیشن گاڑی پٹریوں پر چل رہی تھی ادھر ہم رنگ برنگ کے بادلوں میں سے ہوتے ہوئے چاند کے پاس پہنچ رہے تھے۔ پہلے دوسرے تیسرے نہ معلوم کس آسمان پر تھے کہ یکبارگی جو چینٹے تو گھر سے تین میل پر ایک بڑے جنگشن کے اسٹیشن پر کھڑے ہیں صرف چند زیورات اور چھ میل کا ٹکٹ جیب میں اور ٹکٹ چیکر کا سامنا

ٹکٹ چیکر:۔ یہ ٹکٹ تو صرف فلاں اسٹیشن سے فلاں اسٹیشن تک کا ہے۔

بیس:۔ ہاں آپ ہم کو اِدھر کی گاڑی سے بھیج دیجئے جس قدر دام کہیئے گا وہیں دیں گے۔

ٹکٹ چیکر:۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

میں :- تو آپ میری گھڑی اُس وقت تک کے لئے رکھ سکتے ہیں جب تک میں روپیہ نہ دوں۔ یا میں تار بھیج کر روپیہ منگوا سکتا ہوں۔

ٹکٹ چیکر :- اور وہ لیڈی کون تھیں جو آپ کو رخصت کر کے پھر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

میں :- یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ یہ میں نہ بتاؤں گا۔ آپ کو روپیہ چاہیئے وہ آپ میری گھڑی سے وصول کر سکتے ہیں۔

ٹکٹ چیکر :- چلئے اسٹیشن ماسٹر کے پاس۔ یہ وہی طے کریں گے۔

اسٹیشن ماسٹر صاحب نے ٹکٹ چیکر سے حال سُنا۔ پھر میری طرف مخاطب ہوئے اور تقریباً سب ہی باتیں پوچھیں جو اُوپر آ چکی ہیں۔

اسٹیشن ماسٹر :- اگر تار دیا جائے تو کہاں۔

میں :- فلاں اسٹیشن کو۔

اسٹیشن ماسٹر :- (دلچسپی سے) آپ کا نام کیا ہے۔

میں :- (ایک ذرا رک کر) مُنے (جو میرا عرف ہے)

اسٹیشن ماسٹر :- (اور زیادہ دلچسپی سے) آپ کے والد کا نام۔

میں :- (باپ کا نام غلط بتانا حمیت کے خلاف، شرافت کے خلاف یہ تو غلط نہیں بتا سکتا) میں نے صحیح نام لے لیا۔

اسٹیشن ماسٹر ہاتھ پھیلا کر دوڑے اور مجھ کو گلے سے لگا لیا۔

اس کو حسن اتفاق کہتے ہیں۔ کہاں آپ اور کہاں یہ جگہ۔ آپ ہم کو کیا جانیں مگر ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم نے آپ کو گودیوں میں کھلایا ہے۔ آپ کے والد سے اور ہم سے بڑی مراسم تھی ہم وہانسے برسوں ہوئے چلے آئے۔ ہمارے والد صاحب سید غلام حسین کو آپ جانتے ہونگے۔

میں :۔ "ہاں ہاں خوب جانتا ہوں"۔

اسٹیشن ماسٹر :۔ جب انھوں نے دوسری شادی کرلی تو ہم لوگ اپنے ننہال چلے آئے۔ وہاں کا سلسلہ ہی چھوٹ گیا۔

میں :۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے ملکر"۔

اسٹیشن ماسٹر :۔ اسوقت جو حالت میرے قلب کی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس وقت وہ صحبتیں یاد آگئیں وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ مجھ کو آپ کی صورت دیکھتے ہی کچھ یاد سا آرہا تھا۔ ہنس کر۔ ہی ہی ہی اور یہ لیڈی کون تھیں۔

میں :۔ "اب اس کو کیا کیجیے گا پوچھ کر۔

اسٹیشن ماسٹر :۔ ہی ہی ہی اچھا جانے دیجیے۔ مگر ہی ہی ہی۔ ہمارا زمانہ بھی خوب تھا۔

"میٹھا معشوق"

اللہ بخشے مرزا صاحب کا دماغ بذلہ سنجیوں کا ذخیرہ تھا زبان چٹکلوں کی پوٹ تھی پھر عمر بھی آتنی پائی کہ دوسرے کے پاس اتنا سامان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسکے علاوہ انداز بیان کچھ ایسا تھا کہ سیدھی سیدھی بات روزمرہ کے واقعات جب کہنے لگتے تھے تو داستان گو کی داستانیں مات تھیں۔ نہ معلوم کس طرح کا اُلٹ پھیر لفظوں کا ہوتا تھا۔ کہ جملوں میں نئے نئے معنوں کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔ فقروں میں اصلی معنیٰ کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں جیسے نگینے کی چھوٹ پڑتی ہے۔ اختصار کے بادشاہ تھے۔ ایک دن ایک شاعر صاحب کہنے لگے میں تو بہت کم کہتا ہوں۔ مرزا صاحب بولے خیر غنیمت ہے۔ اُن کا طول بھی ایسا ہی دل آویز ہوتا تھا کسی نے مزاج شریف پوچھا کہنے لگے اگر شکر نہیں بھی ہے تو شکایت کی مجال کس کو ہے۔

ایک قصہ خود اپنے خاندان کا بیان کرتے تھے مگر میں وہ زبان کہاں سے لاؤں گا فرمانے لگے کہ غدر کے بعد ہمارے ایک ادھیالی عزیز تھے۔ لکھنؤ سے فاصلہ پر رہتے تھے۔ اُن کا مقدمہ فاُننانشلی میں تھا۔ ریل اُس وقت تک نکلی نہیں تھی۔ لوگ شکرم اور اونٹ گاڑیوں پر سفر کرتے تھے۔ اُمرا کہاروں کی ڈاک بٹھا کر چلتے تھے۔ متوسط حال لوگ اپنے گھر کی رتھ بہلیوں پر نوکروں

چاکروں کے آہستہ خرام بلکہ مخرام کی چال چلتے تھے۔ انھیں حضرات میں مرزا صاحب کے چچا بھی تھے خود بہلی پر اور مصاحبت میں مختصر ریاست کے دیوان منشی بخت بلی کائستھ جن کے بغیر چھوٹی بڑی ریاست کا ہونا ویسے ہی ناممکن تھا جیسے اُن کی ماش کی دال بے ہینگ کے ہو۔ جلو میں کارکن صاحب جن کو نائب کہہ لیجئے ٹٹو پر ایک لٹھ بند سپاہی اور دو نفر ہمراہی جن میں ایک بڑے مرزا صاحب کا خدمتگار اور دوسرا نائب صاحب کا نیم سائیس اور نیم خدمتگار اور وقت ضرورت باورچی بھی۔ میری گستاخی کی جسارت معاف ہو۔ اس جگہ میں اپنے پڑھنے والوں کا امتحان لینا چاہتا ہوں بھلا بتائیے تو اس کہانی کا ہیرو کون ہے" اتنے کے بیچ موری بند یا ہرانی"۔ یہ انہی لوگوں میں مگر تنکے اوٹ پہاڑ۔ اگر آپ بوجھ گئے تو ہم بھی قائل ہیں۔

بہلی کے ساز و سامان میں بچھونے۔ لالہ کی لوٹیا مرزا صاحب کا لوٹا خانماں مختصر سامان مطبخ ایک عدد توا اور ایک دو پتیلیاں۔ کچھ دال مسالے کی پوٹلی بہلی کے پیچھے جال میں مسل مقدمہ کی دیوانجی کی بغل میں۔ مگر لالہ صاحب اور بڑے مرزا صاحب کے درمیان میں اور گاڑیبان کے پیچھے یہ کون چیز رکھی ہے۔ حضرت اس کو نہ پوچھئے یہی تو قصّے کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کہاں ہم۔ کہاں آپ کہاں یہ کہانی۔ بڑے مرزا صاحب کے ایسے ہزاروں سفر کر گئے ہزاروں سفر کر رہے ہیں اور لاکھوں سفر کریں گے مگر ہر مسافر کی

کہانی تھوڑے سے ہی لکھی جا سکتی ہے۔ داستان گو اور قدر دانوں کو جمع کرنے والی
وہی ہے جو پہلی کے بیچوں بیچ میں بڑی حفاظت سے رکھی ہے۔ یہ مٹھائی کی
ایک ٹوکری ہے جس میں کم سے کم دس بارہ سیر مٹھائی ہوگی۔ اس
پر ایک پرانی چادر سلی ہوئی ہے۔ اور اندازے سے سوغات معلوم ہوتی ہے
تین دن دو راتوں کا سفر ہے۔ خدا خدا کر کے پہلا دن کٹا۔ سرائے کی صورت
دکھائی دی۔ سکریں کھلیں۔ اسباب اُتار لیا گیا لالہ نے عرض کی کہ ان کے
ایک عزیز کا گھر سرائے سے تھوڑی ہی دور پر ہے۔ اگر بڑے مرزا صاحب
اجازت دیں تو یہ وہیں سو رہیں۔ ضروری سامان مثل حقہ بچھونے کے
کوٹھری میں اُتار لیا گیا۔ باقی بھٹیاری کی سپردگی میں دیا گیا۔ اتنے میں
بھٹیاری پان کھائے مُنہ لال کیے مسکراتی سامنے آن کھڑی ہوئی میاں
مٹھائی میرے یہاں نہ رکھتے تو اچھا ہوتا۔ میرے لڑکے بہت شریر ہیں
کھانے پینے کی چیز رکھنے والا میرا گھر نہیں۔ اگر نقصان ہو گیا تو میں کہاں
سے پورا کروں گی۔ بڑے مرزا صاحب پریشان ہو گئے۔ بے ساختہ اپنے خدمتگار
پر نگاہ جمائی۔ اور پھر کارکن صاحب کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ اور
زبانِ حال سے بولے کہ بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ جب کوئی کچھ نہ بولا تو فرمانے
لگے کہ مٹھائی اس کوٹھری میں نہیں رہ سکتی۔ اپنے خدمتگار کی طرف اشارہ
کر کے کہنے لگے کہ جب تک یہ مردود یہاں ہے مٹھائی کی ٹوکری اس کوٹھری

میں نہیں رہ سکتی۔

ملازم :- (نہایت بے باکی سے) جس میں گزشتہ اور موجودہ جھوٹے سچے الزامات کی شکایت بھی پائی جاتی تھی) ہم آپ کو ٹھری کے پاس نہ جائینگے ایسی ایسی مٹھائی کی طرف ہم پھر کے بھی نہ دیکھیں گے راستے میں چھوڑ کر چلے جانا نمک حرامی ہے مگر گھر پہونچ کر یہاں ہمارا حساب ہو جائے تیج پی ہزار نعمت کھائی۔ اب ہم نوکری نہ کریں گے۔ چار آدمیوں کے بیچ میں جب دیکھو آپ ہم کو چوری لگاتے ہیں رہا تھ بیچا ہے کوئی ذات نہیں بیچی ہے۔ جب آبرو ہی نہ رہی تو نوکری کس کام کی۔ اپنے گھر کے سوکھے ٹکڑے ہم کو بہت ہیں۔ جہاں کام کریں گے وہیں پیٹ پل جائیگا۔ بڑے مرزا صاحب نائب صاحب کی طرف اس طرح مخاطب ہوئے گویا انھوں نے ملازم کی باتیں سنی ہی نہیں۔ اور کہنے لگے کہ شیخ جی یہ مٹھائی کہاں رکھوائی جائے۔

شیخ جی :- آپ کو اگر ایسا ہی خیال ہے تو منشی بخت بلی کے ساتھ کر دیجیے صبح کو لیتے آئیں گے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ لالہ تم یہ ٹوکری لیتے جاؤ اسی طرح پہنچ سکتی ہے۔ نہیں تو یہ مردود ضرور کھا جائیگا۔

ناظرین! ایسے بد تمیز۔ بدنیت نوکر کو دیکھنا مرزا صاحب ہی کا کام تھا۔ کیونکہ بجائے ہمارے آپ کے مرزا صاحب ہی کا ہاتھ پتھر کے نیچے

دبا تھا۔ گھر میں ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی۔ اس سے اور بڑے مرزا صاحب سے کچھ لگا سگا ہو گیا تھا۔ بیچارے بھاری بھرکم۔ مہذب شائستہ، ذی عزت آدمی تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ اور اس مقام پر پہونچ چکے تھے جہاں رذیل شریف سب میں مساوات ہو جاتی ہے۔

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کاندریں راہِ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چیز اچھی تھی جیسے گھورے کا گلاب، نہ پگڑی میں لگاتے بنے نہ توڑ کر پھینکتے بنے۔ اسلئے یہی ٹھہری تھی کہ ایک ٹٹی کی آڑ ضرور ہونی چاہیئے اور یہ ملازم صاحب وہی ٹٹی تھے۔ جن کے آڑ میں شکار ہوتا تھا۔ چونکہ ان واقعات سے تینوں فریق واقف تھے۔ اس وجہ سے آپ ہی سمجھئے کہ اس سیٹ میں تفریق کیونکر ہو سکتی تھی۔ رات کو لوگوں نے آرام کیا۔ اور صبح اندھیرے منھ چلنے کا پاتراب ہوا۔ مگر منشی جی کو آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ مرزا صاحب کا ملازم دوڑ اگیا۔ منشی جی آئے تو مگر بہت پریشان اور متفکر

منشی جی:۔ حضور۔ ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ جو سزا دیجیئے کم ہے۔ مجھ سے ایک چوک ہو گئی۔

مرزا صاحب:۔ کیا چوک ہو گئی ہے۔

منشی جی:۔ چوک حضور یہ ہو گئی ہے کہ جب آپ کا خدمتگار پہونچا تو میں نے

اپنے عزیز سے کہا کہ مٹھائی اندر سے منگواؤ اور میں بیٹھ کر داتون کرنے لگا۔
اتنے میں ٹوکری میں، کتے نے منہ ڈال دیا۔
بڑے مرزا صاحب:۔ ایں یہ کیسے ہوا۔ (خدمتگار کی طرف اشارہ کر کے) اور یہ کہاں تھا۔
منشی جی:۔ یہ بھی وہیں تھے۔ انھوں نے ہی دوت دوت کہا مگر وہ منہ ڈال چکا تھا۔
بڑے مرزا صاحب:۔ اجی بالکل غلط۔ کتا وتا کچھ نہیں۔ یہ اسی بے ایمان کی حرکت ہے۔ تم منشی جی اس کو کیا جانو یہ بڑا حرامزادہ ہے۔ حرامخور نمک حرام آدمی ہے۔
ملازم:۔ آپ ہم ہی کو کہتے ہیں دیکھیئے کیٹر ادانت سے بھٹا ہے کہ نہیں اگر میں دوت دوت نہ کرتا تو سب کھا جاتا۔
بڑے مرزا صاحب:۔ کچھ نہیں ایک ہی طرف تو خراب ہوئی ہے اس نے کیٹر ادانت سے پھاڑ ڈالا ہوگا اور پھر دوت دوت چلایا ہوگا۔ اجی میں اس کے ہتھکنڈوں سے خوب واقف ہوں۔ بھٹیاری سے کہو کہ جلدی سے اس کو سی دے یہ مٹھائی خراب ابھی نہیں ہوئی ہے۔

لیجیئے صاحب دوسرے دن کا سفر شروع ہوا۔ اور شام کو بجائے سرائے میں سونے کے میدان میں پڑاؤ ڈالنے کی ٹھہری۔ چاندنی آدھی رات کے پہلے پہلے کھیت کر آئے گی چپقلش سے یہ کھلے میدان کی ہوا کیسی خوشگوار

ہے بہلی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ اور بیل اور گھوڑا درختوں سے باندھے گئے۔
گاڑی بان اور سائیس جانوروں کی حفاظت کے لئے نکل گئے۔ باقی لوگ
مٹھائی کی رکھوالی کرنے لگے۔ بیچ میں مٹھائی کی ٹوکری اور اسکے ایک طرف بہ نفس
نفیس خود مرزا صاحب کا بستر لگا۔ دوسری طرف نائب صاحب تیسری طرف
منشی جی کا اور چوتھی جانب سپاہی تعینات ہوا۔ یہ دیکھ کر خدمتگار نے اپنا مختصر
بچھونا بہت دور ہٹ کر لگایا۔ رات کو دو کا عمل رہا ہو گا کہ دور سے آواز آئی دوت، دوت۔
مرزا صاحب اُٹھ بیٹھے اور نائب صاحب سے کہنے لگے شیخ جی دیکھتے ہیں
آپ۔ کُتا اسی سالے کو دکھائی دیا اور کسی کو نہیں۔
خدمتگار: میاں آپ گالی دے رہے ہیں۔ وہ دیکھئے کالا کالا جا رہا ہے خیر
رات کو بھاگتا ہوا کُتا کسی کو کیا دکھائی دیا ہو گا۔ مگر ٹوکری کا کپڑا ادھر اُسی طرح
پھٹا ہوا پایا گیا۔ اور کچھ مٹھائی بھی اِدھر اُدھر پڑی دیکھی گئی۔ کُتے اور آدمی
کا مسئلہ دوبارہ تازہ ہوا۔ آج بھٹیاری تو تھی نہیں لیکن سوئی دھاگہ
سپاہی کے بٹوے میں نکل آیا اور مرزا صاحب نے خود گانٹھ گونٹھ کر ٹوکری
کو درست کیا اور شام و شام بخیر و خوبی لکھنؤ پہونچ گئے۔
لکھنؤ سے دو چار کوس پہلے جب بڑے مرزا صاحب ایک خاص ضرورت
سے ادھر کے کھیت کی طرف تشریف لے گئے تھے اور خدمتگار لوٹا لیکر ساتھ
گیا تھا اس وقت منشی جی اور سپاہی میں مٹھائی کی باتیں چھڑیں تھیں اِن دونوں

آدمیوں کو مٹھائی سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے یہ لوگ بہتر رائے قائم کر سکتے تھے منشی جی کا خیال تھا کہ مرزا صاحب اتنے شوق سے مٹھائی کی سوغات لیکر چلے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ کُتے والی بات ثابت ہو جائے کیونکہ پھر تو مٹھائی پھینک ہی دینا پڑیگی سپاہی اس کے خلاف تھا مگر اس کی بھی رائے بدل چکی تھی۔ کہ نائب صاحب کا ملازم آگیا اور اس نے آہستہ سے کہا کہ خدمتگار نے مٹھائی کی دو ڈلیاں مجھ کو بھی دی ہیں۔ اب معاملہ صاف ہو گیا۔ مگر مرزا صاحب سے کسی نے نہیں کہا۔ بہرحال لکھنؤ پہونچکر مٹھائی رات کو سرائے کی کوٹھری کے اندر قفل میں رکھی گئی۔ اور رات ہی سے صبح کو کچہری کی تیاریاں شروع ہوئیں منشی جی کسی اور کام سے بھیجے گئے اور خود مرزا صاحب مع نائب صاحب کے عدالت کو چلے۔ احتیاطاً خدمتگار علیہ ما علیہ کو ساتھ لے لیا کہ مٹھائی اس کے دستبرد سے بچی رہے عدالت کے دروازہ پر خدمتگار سے بستہ مانگا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوٹھری ہی میں رکھا ہے۔ مٹھائی کی تباہی اور نیز لذت تینوں آدمیوں کی نگاہوں میں پھر گئی مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ وہی خدمتگار واپس بھیجا گیا اور سخت حکم دیا گیا کہ اُلٹے پاؤں واپس آئے مٹھائی کا خیال بار بار آیا۔ مگر مجبوری تھی۔ اب مرزا صاحب کی اُلجھن نہ پوچھئے بیچارے پریشان حال سراسیمہ ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ کیوں جی۔ شیخ جی اگر پکار ہو گئی تو کیا ہو گا مقدمہ تو خاک میں مل ہی چکا

"رقابت"

مرزا صاحب: اللہ آپ کی نثر میں وہ لطف ہے کہ کسی نظم میں کیا ہوگا۔
آپ کی باتوں میں قصیدہ کی شان، تغزل کی آن نعمت خاں عالی کی نغز گوئی
ہر چیز کا مزہ ہے اور پھر کوئی نہ کوئی نئی بات نیا خیال ضرور معلوم ہو جاتا ہے۔
مرزا صاحب: بھئی خدا کے لئے میری باتوں کی تعریف نہ کرو جہاں کسی
نے اس کا ذکر کیا میں لرز جاتا ہوں مجھے انتلاج ہونے لگتا ہے۔ آپ
جانتے ہیں میرے پیٹ میں بات تو رہتی نہیں اب ذکر آ گیا ہے تو یہ واقعہ
بھی سن لیجئے ۱۸۵۷ء کا ہے ہاں ایک بات عرض کر دوں حضرات اپنی
تاریخ دانی کو تھوڑی دیر کے لئے تہ کر کے رکھ دیں اور وعدہ کریں
کہ جرح نہ کریں گے نہیں تو میں چپ ہوں اس میں چاہے میرا پیٹ
پھٹ جائے یا دماغ کی کوئی رگ خون ہی کیوں نہ دیدے۔
احباب:۔ نہیں نہیں ہم لوگ کچھ نہ کہیں گے۔ آپ کہے جائیے۔
مرزا صاحب:۔ ایک بات اور آپ حضرات کو معلوم ہے کہ فن مصوری
میں استاد لوگ درخت اور باغ کہیں سے عمارت کہیں سے بادل کسی اور
ملک سے لیکر تصویر مکمل کرتے ہیں اگر اسی طرح میں بھی گاؤں، ٹھاؤں، ناؤں
اور زمانہ بدل دوں تو اعتراض نہ کیجئے گا۔

م ۱۷۹:

احباب :- ہم کو شرائط قبول ہیں۔ آپ قصّہ تو شروع کیجئے۔

مرزا صاحب :- لگے ہاتھوں آشنا اور کہے دیتا ہوں کہ بعد کو کہیئے گا کہ یار یہ تو آپ بیتی معلوم ہوتی ہے۔ حافظ کے دیوان سے لوگ فال نکالتے ہیں جس میں ہر شخص کو آپ بیتی مل جاتی ہے مگر آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ تمام فال کھولنے والوں کا پتہ بھی حافظ کو نہ تھا۔ اسی طرح اگر میری گذارش میں کوئی بات فطرت کے موافق نکل آئے تو ممکن ہے کہ مجھ پر گذری ہو ممکن ہے ہم آپ دونوں پر گذر چکی ہو یا آئندہ گذرے۔ خیر ہم پر اب کیا گذرے گی آپ لوگوں پر گذرے۔

احباب :- ہاں ہاں منظور۔

مرزا صاحب :- اچھا تو سنیئے ساٹھ اکسٹھ برس ہوئے اس زمانے میں ہندوستان میں صرف پہاڑ کا نام سنتے تھے مگر جاتے کم تھے اور اس زمانے میں جانا بھی ہمت والوں ہی کا کام تھا۔ کہیں تانگہ کہیں گھوڑا کہیں پیدل کا سفر۔ پھر بیچ میں پہاڑ۔ اگر گر پڑا تو میاں منہ لو کر وں اور اسباب ایک طرف اور بی بی دوسری طرف کھڑے چکوے چکوی کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے نہ یہ ادھر پہونچ سکتے ہیں نہ وہ ادھر۔ یہ اکثر ہوا کرتا تھا اور اس میں دو دو دن لگ جاتے تھے۔ ہم کو جو شامت نے گھیرا تو ہم بھی شملہ پہونچ گیئے۔

ایک بہت بڑی رئیس زادی سے کسی دعوت میں ملاقات ہو گئی اور اپنی نیک دلی سے وہ میرے اوپر بالکل بے غرض عنایت فرمانے لگیں۔ نہایت خوبصورت، بڑی بھولی اور پوری طرح سے تندرست مگر بدقسمتی سے بیش از وقت رانڈ اُس جہاز کی طرح زندگی پار کر رہی تھیں جس کا پتوار ٹوٹ گیا ہو اور ٹوٹنے کے پہلے بھی بہت پُر انار ہا ہو ان کا ذکر کرتے کلیجہ پھٹتا ہے بس یہ سمجھ لیجیئے کہ اس وقت بیاہی گئی تھیں جب شادی کا مطلب نہیں سمجھی تھیں اور رانڈ ہو کر غریب کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ قانوناً اور رواجاً اب ہم عمر بھر کے لیئے ان تمام چیزوں سے محروم ہو گئے جو ہر عورت کا حق ہے۔ بدقسمتی کا خاتمہ رنڈاپے ہی پر نہ سمجھیئے بلکہ تمام باتیں وہ پیش آئیں جو رنڈاپے کے جلو میں چلتی ہیں، مقدمہ بازی۔ بے یاری و مددگاری۔ خود غرض، ہمدرد۔ مُسن عشاق اور گندم نما جو فروش دوکاندار جو کھوٹے پیسے کا دل دیکر جواہرات کا سودا کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

رئیس زادی:۔ مرزا صاحب! اس دعوت کے بعد سے پھر ملاقات ہی نہیں ہوئی آپ کی کوٹھی کا نام بھی مجھکو نہیں معلوم تھا نہیں تو فون پر آپکو تکلیف دیتی۔ اچھا کل اگر آپ لنچ پر تکلیف کریں تو بڑی عنایت ہو گی۔

میں:۔ بہت خوب حاضر ہوں گا شکریئے کی پہلی قسط قبول کیجیئے اور اقساط بعد کو ادا کروں گا۔

رئیس زادی۔ ہنسکر مرزا صاحب آپ باتیں خوب کرتے ہیں اس دن میں آپکے فقروں کو یاد کر کے گھر پر ہنسا کی۔ اچھا کل ضرور تشریف لائیے گا۔

رئیس زادی صاحبہ میرے اوپر بہت مہربان ہو گئیں اور چونکہ میں بالکل بے غرض اور بے واسطہ ملتا تھا اس لیئے باتیں کرنے میں آمد ہی آمد ہوتی تھی آورد کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اب بیگمیں اتنی بڑھیں کہ لنچ پر بلایا تو چائے کے لیئے بھی روک لیا اور اگر جاتے یہ ملاقات ہوئی تو سینما تک ساتھ رہا۔ جوان خوبصورت قابل رحم مستوجب ہمدردی اور پھر عورت کا ساتھ کس کو برا لگتا ہے۔ ایسی صحبتوں میں مجھکو بھی لطف آتا تھا مگر تنہائی میں ملنے کا اتفاق شاذ و نادر۔ تنہائی کا موقع نکالنے کا کبھی دل میں خیال گذرا۔ رئیس زادی تو میرے اوپر عنایت کرتی ہی تھیں مگر ایک اور کن صاحب جو رئیس زادی صاحبہ کے یہاں رہتے تھے۔ وہ بھی بڑی عنایت کرتے تھے۔ بیچارے سمجھے جاتے تھے میری بزرگ داشت کا خیال اتنا کرتے تھے جیسے کسی کی اولاد کرتی ہے مثلاً اگر میں نے سگرٹ کو ہاتھ لگایا تو انھوں نے دوڑ کر دیا سلائی جلا دی۔

میں:- آپ نے کیوں تکلیف کی اتنی دور سے اٹھکر آپ آئے دیا سلائی تو میرے پاس تھی

وہ صاحب:- جی ہاں میرا تو فرض تھا۔ بزرگوں کی خدمت کرنا تو ہر دو کے لیئے باعث فخر ہے جہاں میں پہونچا اور ان صاحب نے کرسی اٹھاکر میرے

لئے رکھدی اگر میں نے شکریہ ادا کیا تو جواب بولے نہیں صاحب بزرگوں کی خدمت چھوٹوں کو کرنا ہی چاہیئے۔ میں اپنی جگہ شرمندہ ہوتا تھا کہ میں اتنا بڑا شخص نہیں ہوں کہ یہ صاحب میری اتنی خاطر کریں شائد یہ مجھکو کوئی بڑا دولت مند جانتے ہوں گے۔ پہاڑ کی چڑھائی سب جانتے ہیں کہ چار قدم میں سانس پھولنے لگتی ہے اور اگر تیز چلیے تو سو دو سو گز میں معلوم ہوتا ہے کہ کلیجہ منھ میں آجائے گا۔ پہاڑ کی ہوا بھی معلوم ہے کہ ایک منٹ ٹھہر جائے اور پھر تازہ دم ہو گئے۔ ایکدن میں مدعو تھا اور یہ خیال کر کے کہ شائد دیر میں پہونچوں ذرا تیز چلا اور جب پہونچا تو ہانپ رہا تھا رئیس زادی نے اپنی صاف دلی کی وجہ سے مجھکو ہاتھوں ہاتھ لیا اور خاطر سے بٹھایا۔

میں :۔ افوہ۔ بیگم صاحب آپ کے یہاں آنے میں یہ آخری چڑھائی بڑی زبردست ہے۔

کارکن صاحب :۔ ہاں ہاں ہنھ ہنھ! چڑھائی! چڑھائی تو ایسی نہیں ہے۔ اور پھر پہاڑ تو ہے ہی۔ ایسی چڑھائی تو کیا ہے اب ضعیفی کا عالم بھی تو ہے۔ عالم پیری میں پہونچکر ایسا ہی ہوتا ہے۔ چلیے ذرا سی دیر آرام کر لیجیئے۔ میں نے شکریہ کے انداز سے جی نہیں تو کہا مگر دلمیں یہ بھی خیال کیا کہ میں اتنا بوڑھا تو ابھی نہیں ہوں جتنی کارکن صاحب کی سعادتمندی ظاہر کرتی ہے ظاہرا بات ہمدردی کی تھی۔ حالانکہ پیش از وقت بڈھا پا

اور موت کی قربت کس کو پسند ہو گی، مگر ان سب سے بالاتر حیرت کی تو یہ بات تھی کہ باوجود ادعائے حاضر جوابی کے مجھ کو کوئی مناسب جواب بھی نہیں سوجھتا تھا اتنے میں رئیس زادی کی گھلاوٹ کی نگاہ میں نے دیکھ لی جو کارکن صاحب پر پڑ رہی تھی اور کارکن صاحب کی بھی وہ نگاہ دیکھ لی جو شکوے کا پہلو لیئے ہوئے جواب میں تھی۔ تب میں سمجھا کہ میری بیش از وقت ضعیف نحیف اور نزار ہو جانے کی کیا وجہ ہے اور کارکن صاحب کی بزرگ نوازی کن بدگمانیوں کی تحت میں کارفرما ہے۔

بیوی کیسی ہونا چاہیئے

مجھ سے سوال کیا گیا کہ بی بی کیسی ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی بڑی بی بی مجھکو دکھادے تو میں اس سوال کا جواب دوں۔ میرے خیال میں بی بی خدا کی نعمت ہے اور خدا کی نعمت کبھی بری نہیں ہوتی بیوی کی وجہ سے گھر میں روشنی سی پھیلی رہتی ہے۔ چراغ کے نیچے ذرا سا اندھیرا بھی ہوتا ہے جیسا کہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اگر کوئی نادان مرد ذری سی تاریکی سے گھبرا کر چراغ کی شکایت کرے تو اندھیرا ہی تو ہے میں اس کا بھی دعویدار ہوں کہ میں نے آجتک کوئی بدصورت عورت بھی نہیں دیکھی۔ آنکھیں رکھتا ہوں اور دنیا دیکھی ہے اگر کہیں ہوتی تو آخر میں نہ دیکھتا۔

اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ بدصورت سے بدصورت جو کہی جا سکتی ہے اُس کا بھی چاہنے والا کوئی نہ کوئی نکل آتا ہے پھر اگر وہ بدصورت تھی تو یہ پرستش کرنے والا کہاں سے پیدا ہو گیا۔ اس لیلیٰ کا مجنوں کہاں سے آگیا۔ نہیں صاحب عورت بدصورت نہیں ہوتی یہ میرا ایمان ہے اور یہی ایمان ہر شخص کا ہونا چاہیئے اصل وجہ یہ ہے کہ عورت میں عمدہ تراشے ہوئے ہیرے کی طرح ہزاروں پہل ہوتے ہیں اور ہر پہل میں آفتاب ایک نئے رنگ سے چمکتا ہوتا ہے یہ ممکن ہے کہ کوئی پہل کسی (خاص شخص) کی آنکھ میں ضرورت سے زیادہ چکاچوند پیدا

کر دے ۔ اور وہ پسند نہ کرے تو اس سے بی بی کی بُرائی کہاں سے ثابت ہوئی۔
۱ ایک پُرانے یونانی ڈرامہ نویس نے لکھا ہے کہ پہلے مرد اور عورتیں اس طرح ہوتے تھے کہ دونوں کی پیٹھ ایک دوسرے سے جُڑی ہوتی تھی اور یہ لوگ راستہ اس طرح چلتے تھے کہ پہلے چاروں ہاتھ زمین پر لگے ۔ اور دونوں سر نیچے آ گئے ۔ اور چاروں پاؤں سر کی جگہ ہوا میں رہے ۔ اس کے بعد پلٹا کھایا اور چاروں پاؤں کے بل کھڑے ہو گئے ۔ اور اس طرح آگے بڑھتے گئے ۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی حالت میں یہ لوگ راستہ بہت تیز چلتے تھے اور چونکہ دو دو آدمی ملے ہوئے تھے اس لیے اُن کی قوتیں بھی دوگنی تھیں دیوتاؤں نے انکی شوریدہ پشتی کی وجہ سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے آخر کار یہ صلاح ٹھہری کہ یہ بیچ سے علیٰحدہ کر دیئے جائیں تاکہ اُن کی قوتیں آدھی رہ جائیں ۔ اور اُنکے چڑھاؤ بھی دوگنے ہو جائیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ تب سے ہر عورت اور ہر مرد اپنا اپنا جوڑا ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جن کو ملجاتا ہے وہ خوش رہتے ہیں ۔ جن کو بد قسمتی سے نہ ملا وہ غریب عورت کو دوکھ دیتے ہیں کسی کو بے زبان نموہی بیوی پسند ہے کسی کو ایسی عورت اچھی لگتی ہے جس کی زبان ہر وقت کترنی کی طرح چلتی رہے اگر خوش قسمتی سے وہی قدیم جوڑا مل گیا تو تو دونوں خوش ہیں نہیں تو بی بی غریب کو بُرا کہتے ہیں ۔ آخر اس غریب کا جوڑا ابھی تو بچھڑ گیا ہے مگر اس کی کوئی بات بھی نہیں پوچھتا یہ خیال غلط ہے

کہ صرف اچھوں ہی اچھے کا ساتھ مزیدار ہوتا ہے اگر تال میل ہوا اور پرگت مل گئی تو جن لوگوں کو ہم اپنے زعم ناقص میں برا سمجھتے ہیں انکی بھی زندگی لطف کی گذرتی ہے آپ نے سنا نہیں۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تجھسی کوئی شفتل ہو

ہمارے پڑوس میں ایک میاں بی بی رہتے ہیں جن کا جوڑا پوری طور سے مل گیا ہے یہ دونوں آدمی انتہا درجے کے کاہل۔ پرلے سرے کے جھوٹے اور ودسے کے ناکارے ہیں۔ مگر جب دیکھیے دونوں قمریوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور گل بہیاں ڈالے بیٹھے ہیں ان کے دو بچے ہیں کسی نے ان بچوں کا دھویا ہوا منھ کبھی نہیں دیکھا۔ کپڑے ان لوگوں کے تن پر کٹ کٹ کے گر جاتے ہیں مگر دھوبی کو دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ بچوں کے کپڑوں میں ذرا سی پھونک بڑھ کے نیچے سے اوپر تک پہنچ جاتی اور پھٹ کر علیحدہ ہو جاتی ہے مگر سوئی تاگے کی شرمندہ نہیں ہوتی۔ میں نے ایکدن اس عورت سے پوچھا کہ تمہارے میاں تم کو چاہتے ہیں کہنے لگی کہ اتنا چاہتے ہیں کہ کھانا لیے بیٹھے رہتے ہیں مگر بغیر میرے نہیں کھاتے۔ دوسری مثال محبت کی دی کہ کل صبح بٹیر کے شکار کو جا رہے تھے۔ میں نے کہا روز جاتے ہو مگر کبھی ایک بٹیر بھی گھر میں نہ آیا بس غصے میں ایک ڈنڈا میری پیٹھ پر رسید کیا میں بھی دوپہر تک منھ پھلائے رہی اور

نہیں بولی۔ تب دوڑے گئے، تیل کی جلیبیاں لے آئے تب میں بولی۔ کبھی برابر کے جوڑ میں لطف آتا ہے کبھی ایک نرم اور ایک گرم زندگی کو آرام دہ بنا دیتے ہیں

کسی رانڈ بیوہ کے یہاں ایک طوطا پلا تھا۔ وہ ہر وقت اس عورت کو مغلظات سنایا کرتا تھا ایکدن ان کے یہاں پیر صاحب تشریف لائے طوطے کو سن کر کہنے لگے ارے تیرا طوطا تو بڑا فحاش ہے۔ پنجرا کھول دے یہ اڑ جائے کہنے لگی رہنے دیجئے میاں صاحب گھر میں مرد دے کی ایسی بولی تو سنائی دیتی ہے

کوئی شخص شراب بہت پیتا تھا اس نے پادری کے کہنے سے شراب ترک کر دی کچھ دنوں کے بعد پادری صاحب اپنے پند و نصائح پر ناز کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور پوچھا کہو اب تو تمھارے میاں مار دھاڑ۔ دنگا فساد نہین کرتے، نہایت مایوسی سے کہنے لگی، ارے حضور اب تو وہ میاں ایسے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ کوئی دیکھے تو کہے کہ مہمان طریق گھر میں آئے ہیں۔

ڈکنس نے ایک شخص سائکس نامے کا حال لکھا ہے کہ وہ بھی اپنی نیک شریف خصلت محنتی چاہنے والی کو نہ صرف مارتا ہی تھا بلکہ جو کچھ محنت مزدوری کر کے وہ کما لاتی تھی وہ بھی شراب میں اڑا دیتا تھا اور خود اس میں دنیا کا کوئی عیب نہ تھا جو نہ ہو۔ جو ریہ لے سرے کا تھا ایک ہمدرد نے اس عورت کو مشورہ دیا کہ اس کو چھوڑ دے اس نے کہا کہ افسوس ہے دنیا اس کی برائی سے واقف ہے خوبی سے نہیں واقف ۔۔ اب ان باتوں کے بعد کوئی

کیا کہہ سکتا ہے کہ کون مرد اچھا ہے اور کون عورت۔

میرے ایک دوست ایک ڈپٹی صاحب کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ دورے پر تھے اور میں ان سے ملنے گیا۔ معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب غسل فرما رہے ہیں۔ یہ بیٹھے رہے، جب دیر ہوئی تو انھوں نے پھر دریافت کیا معلوم ہوا ابھی تک غسل میں ہیں۔ سرکاری کام تھا جس کے ناتمام رہ جانے میں دونوں کی بدنامی تھی اس وجہ سے سنگ آمد سخت آمد انتظار کرتے رہے مگر ڈپٹی صاحب آج نکلنے کا نام لیتے ہیں نہ کل۔ اِنکی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں مگر اُن کی برآمدگی کی کوئی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ خیر کئی گھنٹوں کے بعد طلبی ہوئی تو یہ کیا دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی صاحب دفتر کی میز کے پاس کرسی پر بڑی شان سے تشریف فرما ہیں مسلوں کا ڈھیر لگا ہے مگر خالی تپلون اور اور گھڑ اویں پہنے بیٹھے ہیں، کاندھوں پر تپلون کی گیلس البتہ دکھائی دیتی ہے۔ کام پورا کر کے جب یہ باہر نکلے نہ تاب ہوئی۔ اردلی سے اس انوکھی وضع کا سبب پوچھ ہی بیٹھے۔ معلوم ہوا بیگم کو کسی بات پر غصّہ آگیا ہے اُنھوں نے حکم دیا کہ آج اس موتڈی کاٹے کو کپڑے نہ دیئے جائیں۔ خیال تو کیجئے جاڑوں کا مہینہ، مچھے کی زندگی لیکن اگر ڈپٹی صاحب کو یہ باتیں پسند ہیں تو ہم آپ برا ماننے والے کون۔

بیٹر نیڈر نے لکھا ہے کہ اسکاٹلینڈ میں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ ابھی

بی بی کو مارتا ہے مجھے ایسا جوش پیدا ہوا کہ میں گھر میں گھس گیا اور اس عورت کو بچانے لگا میرا یہ کرنا تھا کہ دونوں میرے اوپر پلٹ پڑے اور مجھکو مار کے باہر کر دیا۔ کہیئے صاحب ہم تم راضی تو کیا کریں قاضی غالب نے کہا ہے

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو وہ کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کیوں صاحب اگر کسی کو فتنہ و فساد ہی والا شریک زندگی پسند ہو تو ہماری آپکی پسندیدگی ناپسندیدگی کیا چیز ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بی بی اچھی اور یہ بری ہے۔ اکثر دل کو آس پاس کے گھروں سے اس طرح کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہو گا کہ ارے یہ ہاتھ تھکیں، الٰہی تن تن کوڑھ ٹپکے پچھاڑی کھاٹ نکلے تب میرے دل میں ٹھنڈک پڑے۔ اڑوسی پڑوسی ادھر اُدھر کھڑے نفرین کر رہے ہیں کہ بھئی کیا بُرے لوگ ہیں۔ کیا کُتّے بلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیجیئے صاحب شور و شغب مِٹ گیا میاں لنگڑا اپنے کام پر چلے گئے بی ہمسائی کچھ تو ہمدردی کرنے کے خیال سے اور زیادہ تر ٹوہ لینے کو کھڑکی کی طرف سے اندر داخل ہوئیں۔ دیکھا کہ ایک طرف کا گال سوجا ہوا ہے آنکھوں کی لالی باوجود منہ دھونے کے ابھی مٹی نہیں ہے حال تو سب پہلے ہی سے جانتی تھیں مگر انجان بنکر پوچھنے لگی۔ اے بہن یہ کیا ہوا جواب ملا بہن کیا کہیں آپ ہی لڑے آپ ہی

خفا ہو کر چلے گئے کھانا بھی نہیں کھایا یہ دیکھو ویسے ہی رکھا ہے پان کی ڈبیا بھی نہیں لے گئے۔ دل کڑھتا ہے کہ دن بھر بن پان کے رہیں گے منھ صاف بن ہو جائے گا۔ لیجئے صاحب یہ تو گئی تھیں کہ وہ میاں کی اگر ایک برائی کرینگی تو ہم دس کرینگے۔ وہاں رنگ ہی دوسرا دیکھا۔ اپنا سا منھ لیکر چلی آئیں۔

ایک میرے مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ بی بی کے ناز بے انداز ہر طرح کے اٹھائے جا سکتے ہیں لیکن ایک بات ناقابل معافی ہے وہ یہ کہ یہ لوگ کبھی کبھی مر جاتی ہیں اسی کے مقابل یہ دوسرا لطیفہ سنیے:۔

ایک صاحب نے بیان کیا کہ میری بی بی دو ہی برس کے اندر داغ مفارقت دے گئیں۔ ذرا سا لڑکا ایک چھوکرا اپنی نشانی چھوڑ گئیں۔ میری ایک بڑی سالی تھیں جو شاید اسی انتظار میں پہلے ہی سے رنڈاپا کھیے رہی تھیں۔ خوشدامن صاحبہ کہنے لگیں میاں تمہاری سالی موجود ہے گر عقد کر لیتے تو مردہ رشتہ پھر زندہ ہو جاتا۔ میں نے بھی سوچا کہ جب وہ جوان جہان نہ رہی تو یہ ادھیڑ کیا رہے گی۔ لاؤ کر ہی لو۔ لڑکے کی خالہ ہے بچہ بھی پل جائے گا۔ جہیز بھی اچھا خاصہ ہاتھ لگے گا۔ انکے مرنے کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ اپنی ہمسن ڈھونڈ کر لائینگے۔ لیجئے صاحب عقد ہونے کو تو ہو گیا مگر وہ آج مرتی ہیں نہ کل۔ وہ تو پہلے ہی سے بوڑھی تھیں میرے بھی دانت گر گئے مگر وہ جانے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ ادھر میں کہیں سفر کو تیار ہوا اور ادھر وہ امام ضامن لئے ڈیوڑھی کے پاس

پہونچ گئیں۔

امام ضامن کی ضمانت میں سونپا کہو قبول کیا جس طرح پیٹھ دکھاتے جاتے ہو اسی طرح اصل خیر سے واپس آکر مُنھ دکھانا نصیب ہو ان صاحب کا بیان ہے کہ بڑی بی بی کے مرنے سے تو مایوسی ہو ہی چکی ہے میں نے بھی یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ادھر انھوں نے امام ضامن باندھا ادھر میں نے بھی ایک جینھڑ الیکر ان کے داہنے بازو پر باندھ دیا اور کہنا شروع کیا خدا اٹھا لے سائے میں ہمیں پروان چڑھائے" وہ پوپلا منھ ٹھوا سا لیکر ہنسنے لگیں ہٹو بھی تمھاری مذاخ ۔۔۔ کی باتیں کبھی نہ جائیں گی۔ اب ذرا غور فرمایئے۔ اگر ان صاحب کو کہیں ہنے صلاح دی ہوتی کہ بڑی سالی سے کر لو تو خدا واسطے کو ہم ہی تو بدنام ہوتے نہیں صاحب اس معاملے میں یہی ٹھیک ہے کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ۔

مذاق عشق یہ ہے نکتہ چیں نہ بن ناصح
نگاہ میری پرکھ میری آنکھ میری ہے
جنھیں نظر نہیں اے آرزو وہ کیا جانیں
خزف سمیٹے ہیں یا موتیوں کی ڈھیری ہے؟

———— ٭ ٭ ٭ ————

ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور نے بہت سے کام کیئے اور ہر کام میں چار چاند لگا دیئے۔ گانے میں نئے نئے راستے نکالے۔ بڑھاپے میں تصویر کھینچنے کی سوجھی وہ وہ تصویریں کھینچیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ رنگوں کو زبان دیدی لائنس کو وہ کمال بخشا جیسے کوئی سامنے کھڑا بھاؤ بتا رہا ہے اور پھر اپنا رنگ سب سے الگ دکھا۔ کبھی کسی کی نقل نہیں اتاری۔ پالیٹکس جس سے شاید ان کی طبیعت کو مناسبت نہ ہی ہو اس میں بھی بڑے بڑے کام کیئے تقسیم بنگال کے واقعات جن کو یاد ہوں گے وہ جانتا ہوگا کہ ٹیگور نے اس میدان میں بھی کیا کچھ کر کے نہیں دکھایا۔ مگر ہر چیز میں اپنا رنگ جو کھا رکھا۔ اس زمانے میں بنگال میں بہت سی باتیں ملک پرستی کے نام سے ایسی بھی ہوئیں جن میں بناؤ کم اور بگاڑ زیادہ تھا۔ برخلاف اس کے ٹیگور نے جو کچھ بتایا جو سکھایا کسی چیز میں تعمیری پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیا زراعت کی طرف انھوں نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ کوآپریٹو کام میں انھوں نے حصہ لیا۔ سب کچھ ہوا مگر دل کوئی اور ہی چیز ڈھونڈھا کیا آخر پالیٹکس چھوڑ چھاڑ کے اصلی رنگ پر آگئے شاعری اور تعلیم شانتی نکیتن کے نام سے کون ایسا مہذب ملک ہے جو نہیں واقف۔ گیتانجلی نے کس ملک کو روحانیت

کا پیغام نہیں پہونچایا۔ اس اسّی برس کی چھوٹی سی زندگی میں ایسا کر دیا کہ ہندوستان بھی ادبی پہلو سے کسی گنتی شمار میں آنے لگا اسّی برس کی عمر کم نہیں کہی جا سکتی۔ اگر ہم نے اتنی عمر پائی تو اجیرن ہو جائیگی۔ خود ہمارے کاٹے نہ کٹیگی۔ اور دوسروں کے لیئے اندھی روگ ہی آ دے گا۔

لیکن ٹیگور کے لیئے ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ سیمپسن (samson) جب اندھا کر دیا گیا تو اس نے کہا روشنی کی ایسی نعمت اتنی چھوٹی مختصر اور نازک جگہ میں کیوں رکھی گئی کہ جس بدتمیز کا دل چاہے اس کو بگاڑ کر اندھیر کر دے ارے اس کو تو سر سے لیکر پاؤں تک ہر جگہ ہونا چاہیئے کہ اگر کوئی مٹانا بھی چاہے تو نہ مٹا سکے یہی حال اچھے آدمیوں کی زندگی کا ہوتا تو خوب تھا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ٹیگور اگر صرف اسّی برس جیئے تو کیا جیئے اُن کو تو اس طرح جینا چاہیئے تھا کہ جیسے اُنکی شاعری زندہ رہے گی۔ رابندرناتھ ٹیگور کے بہت سے کام ہیں ۔ اس وقت میری نظر میں دو کام ہیں ایک تو ان کی یہ کوشش کہ دنیا ملک اور قوم کی پوجا چھوڑ کر آدمی کی پوجا کرنے لگے۔ اور یہ سوچنے لگے پہیا کہ ہم جاپانی ہیں اور ہم روسی ہیں ہر شخص یہ کہے کہ ہم انسان ہیں اس میں ٹیگور ویسے ہی ناکامیاب رہے جیسے بابا آدم ہابیل قابیل کے ملانے میں ناکامیاب رہے تھے آیا ایسا سبق دینے میں وہ کامیاب ہو بھی سکتے تھے یا نہیں۔ اس کو آپ لوگ طے کیجیئے۔

دوسرا کام اُن کی شاعری ہے۔ اس چیز میں کامیابی کے ڈنکے بجے ہوئے ہیں دنیا اُن کا لوہا مانے ہوئے ہے ہم کیا اور ہماری تعریف کیا اگر کچھ کہیں گے بھی تو اپنا دل خوش کرنے کے لئے۔ ٹیگور دنیا کا شاعر ہماری تعریف کا محتاج نہیں۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لئے دوسری دنیا میں پہونچ گیا ہے۔

ٹیگور کے یہاں اگر صرف اسی قدر ہوتا تب بھی اُن کا سکّہ دنیا کی ادبی تاریخ پر بیٹھ چکا تھا مگر اُن کے یہاں تو نہ معلوم کیا کیا ہے شاید گارڈنر میں ایک جگہ کہتے ہیں "جوگیا رے تو نے کاہے مورے دوار سے بین بجا دے" سوچئے ذرا اس کے مزے تو لیجئے۔ لیجئے پھر پڑھے دیتا ہوں۔ جوگیا رے تو نے کاہے مورے دوار سے بین بجا دے،، کون اس کے معنی سمجھا سکتا ہے اس کے مزے روح لیتی ہے دوسری دنیا سے معلوم ہوتا ہے کوئی تار لگا ہے جو دلیں کھٹ سے ہو جاتا ہے کہیں سے پیغام تو ضرور آتا ہے۔ مگر اس پیغام کے معنی پوری طور سے سمجھ میں نہیں آتے۔ جیسے کسی عورت کے پاس اس کے شوہر کا خط دور دیس سے آوے وہ پڑھ نہ سکتی ہو مگر لفافہ کھول ڈالے اس کے اندر دو چار سوکھی پنکھڑیاں گلاب کی رکھی ہوں اور اس وجہ سے وہ بغیر خط کو پڑھائے مطلب سمجھ جائے پھر بھی خط پڑھانے کی ضرورت باقی ہے۔ اس بھجن میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ رہا پورے مطلب کا پڑھوا کر سننا

یعنی بھجن کا پیغام پورم پورا پا جانا یہ ہمارے آپ کے سمجھنے کی چیز نہیں وہ ہماری روح کا ٹکڑا جانے اور وہ سمو چا جہاں سے وہ ٹوٹ کر آیا ہے کہ جوگیا دوارے آکے بین کیوں بجاتا ہے۔ بہار کے قدیم شاعر ودیا پتی کی زبانی رادھکا نے اپنی سہیلیوں سے شری کرشن کے ہجروں کا حال بیان کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جوگی بین پر کیا بجاتا ہے : اور کون سمجھتا ہے ایک جگہ ٹیگور نے کہا ہے میں تیرے بھجن گانے کے لئے پیدا ہوئی ہوں میرا دل چاہتا ہے کہ آدھی رات کے سمے سکوت کے مندر میں مجھ سے خاموشی کا گانا سُن اور صبح کو دربار میں بُلا۔ ہر مذہب میں دو طرح کی عبادتیں ہیں۔ ایک ضروری جن کو انگریزی میں ریچوئلسٹک کہتے ہیں اور ایک وہ جو محبت کے تقاضے سے بعض پاک دلوں میں آتی ہیں۔

صاف بات ہے کہ اس قسم کے ذاتی رشتے خود آدمی نہیں قائم کر سکتا جیسے تالی بن دونوں ہاتھوں کے نہیں بجتی اسی طرح یہ بھی بغیر اوپر کے اشارے کے نہیں ہو سکتا یہ آدھی رات کے سمے سکوت کا مندر خاموشی کا گانا وہی آرزو ہے جو شاعر کے دل میں پیدا ہوئی ہے۔"

پھر ایک ایک لفظ غور کرنے کے قابل ہے آدھی رات کے سمے وہ تجربہ ہے جو نہ صرف ہندوستان والوں پر موقوف ہے۔ بلکہ ہر ملک میں اور ہر صاحب دل کو معلوم ہے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے شخص علیہ السلام کا قول ہے کہ آدھی رات کے تیر نہیں خطا کرتے مسلمانوں کے یہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

رات کے وقت دو دو چار چار آدمی اٹھو اور غور کرو ممکن ہے۔ الفاظ میں
مجھ سے کچھ فرق ہو گیا ہو مگر مفہوم یہی ہے عیسائیوں کی Litany نماز
مسلمانوں کے یہاں تہجد ہندوؤں کے یہاں دھیان اور بابی قرۃ العین کے یہاں
اندھیرے شب کی آہ یہ سب ٹیگور اور یہ ہے نور کی زنجیر جس میں سب مذاہب
ایک سلسلہ میں ہیں جیسے موتیوں کی لڑی جیسے آنسوؤں کے تار۔

خدمت کو ایک جگہ سراہا ہے جس کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لئے سمجھ میں آتا ہے
کہ غریبی پر سے امیری قربان کی ہے۔ کہا ہے میں بہت جھڑ کے زمانے کا وہ
اجلا بادل ہوں جو ہوا سے ہلکا اور برسنے والے پانی سے خالی ہے اگر تم کو میرا
رنگ روپ دیکھنا ہے تو دھانوں کی ہریالی میں دیکھو پھر فرمایا ہے۔ جو لوگ
دوسروں کی بھلائی کرتے پھرتے ہیں۔ اُن کو خود بھلے ہونے کا موقع ہی نہیں
ملتا۔ میرے سننے والو اس شعر کا مطلب بالکل صاف ہے ماشاء اللہ آپ
تو ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔ اگر اتفاق سے آپ نہ سمجھے ہوں تو میں نہیں سمجھا سکتا
کیونکہ مجھ کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں لوگ خفا نہ ہو جائیں۔ شاعری وہ ہے جس کی سچائی
دل میں اُتر جائے۔ ایک جگہ کہتا ہے اُنھوں نے نفرت اور قتل سے کام لیا
خدا کو شرم لگی اور اس نے سبز گھاس سے اس کو چھپا دیا۔

(دیگر) آج کھجور کے پتے ہل رہے ہیں چودھویں کا چاند سمندر کو ابھار رہا ہے
جیسے زمین کا دل دھڑک رہا ہو تو اِس مسوسے دلمیں محبت کا میٹھا درد کس آسمان

سے آئی: اہاہا کوئی شک نہین کہ ٹیگور ہندوستان ہی کا شاعر نہیں تھا۔ بلکہ دُنیا کا شاعر تھا۔ اور میں تو کہوں گا کہ عقبیٰ کا بھی شاعر تھا۔ ایسے ایسے پیغام لاتا ہے کہ اس دنیا میں تو اس کا پتہ نہین چلتا ہاں البتہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کے مواعظ وغیرہ پڑھیئے اور اسکے بعد ٹیگور کا بھجن پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ بھجن نہیں ہے بلکہ کوئی خوبصورت عورت مذہب اور عقیدت کا چوکھہ چراغ جلائے اسکی روشنی مین اہسار کو جا رہی ہے۔

حضرات شاعر کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ آپ کو نئی نئی باتیں ہی بتایا کرے بلکہ وہ یگانگی ہمدردی بھی کرتا ہے رنج کی محبت بھی جتاتا ہے رنج مصیبت مین دل بھی بہلاتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست پر مصیبت پڑی اُن کا قول تھا کہ میری دلی تکلیف مین تین آدمی بہت کام آئے ایک تو ایک شاعر ہیں اور موجود ہیں اگر ان کا نام لے لوں گا تو لوگ کہیں گے کہ دوستوں کا اشتہار دینے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔ دوسرے حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ تیسرے ٹیگور کی مثال دیتے تھے۔ قصہ ذرا طولانی ہے مگر سن لیجیے ٹیگور کی ایک نظم ہے اس کے مرنے کے بعد میں نے اس کے اسباب مین خطون کی ایک پوٹ پائی یہ وہ خطوط تھے جو مین نے کبھی اس کو لکھے تھے اُس نے میرے خطوط اس احتیاط سے عمر بھر رکھے اب مین اس کے احسان سے کسطرح سبکدوش ہو سکتا ہوں کہ وہ اپنے لکھے ہوئے خطوط صرف اسیوجہ سے کہ اس نے ان کو محفوظ رکھا تھا عمر بھر حفاظت سے رکھون

بیان کرنے والے کا بیان ہے کہ مجھکو بھی اسی طرح کا ایک خطوں کا پوٹ ملا تھا جو مجھکو بھی ایسا ہی عزیز تھا۔ جیسے ٹیگور کو اُن کے خطوط رہے ہوں گے صرف فرق اتنا تھا کہ یہ معلوم کر کے شاعر بھی بالکل اسی طرح کی مصیبت میں پڑ چکا ہے۔ ایک طرح کی تسکین ہوتی تھی۔ جیسے بے آب ریگستان میں کسی دوسرے ہمسفر کو پا کر ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا شاعروں سے بھری پڑی ہے۔ مگر ایسے شاعر بہت کم ہیں کہ جن کی شاعری سے رنج کے معاملات میں مدد ملتی ہو حافظ کے یہاں فال دیکھی جاتی ہے جو ممکن نہ تھا۔ اگر شاعر کے خیالات فطرت کے موافق اور اس طرح دوسروں سے ملتے جلتے نہ ہوتے۔

جرمنی شاعر گوئٹے کے لئے بھی یہی کہا جاتا ہے: ورٹر کے خطوط آج بھی کلیجہ نکال لیتے ہیں۔ اور بھی بہت سے ہوں گے میرا دعوٰی صرف یہ ہے کہ ٹیگور بھی اُنھیں نادر اور کمیاب شاعروں میں سے ہیں جو اکثر رنج کے موقعوں اور اور روزمرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں ایک مثال اور سُن لیجئے ایک گھر میں کئی ایک لڑکیاں تھیں کسی کو ماں سب سے زیادہ خوبصورت کہتی تھی کسی کو باپ سب سے زیادہ خوبصورت کہتے تھے ایک لڑکی تھی جس کو ماں باپ کے علاوہ دوسرے بھی خوبصورت کہتے تھے مگر ایک بات پر سب متفق تھے۔ یعنی یہ لڑکی جو گھر کی سنڈریلا تھی ہر وقت کام کلج میں لگی رہتی تھی۔ بارنارڈ شا نے کہا ہے کہ سب سے کم بدصورت لڑکی خاندان کی پری کہلاتی ہے قصّہ مختصر یہی خاندان کی پری تھی جس کو بدقسمتی

سے چیچک نکل آئی۔ دشمنوں کی نظر لگ گئی جان کے لالے پڑ گئے۔ بیماری ا کٹ گئی مگر رنگت جانے اور چیچک کے نشانوں کا دھڑکا چاہنے والوں کے دل پر تھا۔ اتنے میں ٹیگور نے مدد کی۔

اُن کی اسٹریے برڈس” میں ایک شعر نکل آیا۔ چاند نے کہا میری چاندنی سب کے لیئے ہے میرے داغ صرف میرے لئے” میرے سُننے والو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس شعر نے وہ کام کیا کہ مرہم کیا کرے گا نہ صرف وہ لڑکی اپنی مصیبت پر راضی ہو گئی بلکہ گھر میں اس شعر کی وجہ سے ہر شخص کا رنج کم ہو گیا۔

اس طرح کی صرف ایک مثال اور اسی پر ختم اور آپ حضرات کے لیئے دعا۔ اے عورت جب تو اپنے گھر کے کاروبار میں چلتی پھرتی ہے تو تیری چال میں ایک بے تکلفی ہے۔ جیسے پہاڑی ندی کنکریوں کے اوپر سے گاتی ہوئی بہتی ہے۔ میرے مرد سننے والو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ کتنی بار اس نے دنیا کو جنت بنا دیا ہے۔ میں نے بھجنوں کا ترجمہ انگریزی سے اسی طرح کیا ہے جیسے فٹز جیرلڈ نے عمر خیام کا ترجمہ کیا ہے یعنی لفظی ترجمہ نہیں ہے صاف بات ہے کہ کہاں ٹیگور کی زبان اور کہاں ہماری۔ لیکن یہ کوشش ضرور کی گئی ہی ہے کہ جہاں تک بس چل سکے خیالات وہی رہیں۔ نہ معلوم کامیابی بھی ہوئی ہے یا نہیں حالانکہ

اس کی اُمید بہت کم ہے۔ کیونکہ خود ٹیگور نے ایک شعر میں کہا ہے لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں کہ تمھارے اس شعر کے کیا معنی ہیں میں جواب دیتا ہوں کہ اس کے کچھ معنی نہیں۔ مگر وہ ملوائی برس میں تمھارے ملک کی پیاس نہیں بجھی پھر لوٹ آؤ اور دیس کو سیراب کر دو۔

گدھی کی ہتیا

لچھمن تنبولی کی پان کی دکان سب دکانوں سے بڑی تھی۔ دیساور سے پان منگواتے۔ دریبے میں بھی ہر شخص کی نگاہ لچھمن پر پڑتی تھی۔ مکان بھی پکا تھا جو عزت برادری میں لچھمن کی تھی دور دور کسی تنبولی کی نہ تھی۔ لڑکا کچھ شُدبُد پڑھ بھی گیا تھا لڑکی اچھے گھر بیاہی بھی گئی تھی بیوی سر سے پاؤں تک چاندی کے زیور سے لدی ہوئی تھی سونے کے بھی دو ایک عدد تھوڑے دن ہوئے بنوائے تھے جس سے برادری کی نگاہ میں انکی آبرو اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اگر کمی تھی تو صرف یہ کہ خود انکے کوئی بنواڑی نہ تھی حالانکہ کوئی زیادہ ایسا ہرج نہ تھا۔ پھر بھی اگر اپنی بنواڑی لگ جاتی تو اچھا تھا۔ برادری میں اور فضیلت بڑھ جاتی۔ کچھ تو اسوجہ سے کہ لڑکا لاڈ دل کا پلا ہوا اس پر کام کا بوجھ نہیں ڈالتے تھے۔ دوسرے یہ خیال تھا کہ اگر زمیندار سے زمین مانگیں گے تو کسی غریب ٹٹ پونجیے کے مقابلے میں اُن سے زیادہ لگان مانگا جائے گا اور پھر انکا بنیا سودا کرے،، پان اُدھار بھی دینا پڑیں گے۔ ادھار دینے میں کوئی ہرج نہیں مگر وقت پر روپیہ نہیں مل سکتا۔ انھیں وجوہ سے بنواڑی گومگو میں پڑی رہی خدا کا کرنا ایسا کہ ایکدن خود زمیندار نے کہا ارے لچھمن تم بنواڑی کیوں نہیں لگاتے۔ لچھمن بولے، سرکار کا حکم ہو تو لگ

جائے کون مشکل ہے۔ یہ باتیں لڑکے نے سنیں گھر جا کر اپنے باپ سے تقاضا شروع کر دیا۔ لچھمن کی ہمت نہیں پڑتی تھی مگر لڑکے نے ماں سے بھی کہلانا شروع کر دیا تب بولیں لڑکا سامرس ہے ایک کے دو ئی آدمی کام کرے کا ہوئے گئے اب نبواڑی نہ لگی تو کون دن آئی۔

گھر سے تھوڑی ہی دور وہ ٹکڑا تھا جس پر لچھمن کی نگاہ بہت دنوں سے تھی اور جس کو زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ٹکڑے کے پیچھے تالاب بھی ہے جب تک اس میں پانی رہے گا تب تک سینچنے کی بھی آسانی ہو گی۔ البتہ یہ بات ان دھوبیوں کو نہ پسند آئے گی جو اس میں کپڑے دھوتے ہیں لچھمن بہت مرنج مرنجان آدمی تھے سوچا کہ اگر دھوبی لوگ بہت برا مانیں گے تو ہم اپنا کچا کنواں الگ کھود لیں گے۔ آخر جیٹھ بیساکھ میں جب تالاب سوکھ جائے گا تو یوں بھی کنوئیں سے ہی سینچنا ہے۔ بانس وغیرہ کا انتظام شروع ہو گیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں نبواڑی لگ گئی۔ گھر کے دو آدمیوں میں ایک ہر وقت وہاں رہنے لگا۔ روٹی وغیرہ کھانے کی ضرورت ہوئی تو انھیں دھوبیوں سے کہہ دیا۔ کہ ذرا دیکھے رہنا۔ لچھمن کے سلوک کی وجہ سے تمام دھوبی نبواڑی کی اپنے مال کی طرح حفاظت کیا کرتے تھے۔ مگر اُجیالی دھوبن کی ایک گدھی تھی وہ لنگڑی بھی تھی اور بیمار بھی رہتی تھی اسلئے وہ بغیر چھاندے کے یوں ہی گھوما کرتی تھی اس پر کپڑے بھی نہیں لادے جاتے تھے۔ تھی تو وہ گدھی مگر جنس کی وجہ سے ضرورت

نے اس کو بہت چالاک بنا دیا تھا یعنی نگاہ بچا کر بنواڑی کے اندر پہونچ جاتی تھی اکثر دیکھا گیا کہ لچھمن دھوبن سے خوش گپیاں کر رہے ہیں) اور اٹھ کر دیکھتے ہیں تو گدھی بنواڑی کے اندر براج رہی ہے ۔ لچھمن اسکو ہنکا کر باہر کر دیا کرتے تھے۔ اور اجیالی سے اس طرح دوستانہ شکایت کرتے تھے کہ گویا گدھی کی ناشائستہ حرکت میں گدھی اجیالی اور لچھمن بھی تینوں برابر کے شریک ہیں۔ لڑکا جوان خون اگر گدھی کو بنواڑی میں دیکھتا تو وہ غصہ سے اولہنا دیتا۔ اجیالی بھی لڑنے میں کسی سے کم نہ تھی مگر لچھمن کا برتاؤ اور اپنی ہی خطا دہ دو چار گالیاں گدھی کو دے اور بھیا منوالی کہہ کے معافی مانگ لیتی۔ ہفتے میں ایک مرتبہ اجیالی گھاٹ پر آتی تھی بلکہ کپڑوں پر استری کرنے گاہکوں کے یہاں کپڑے پہونچانے کا کام کرتی تھی۔ آج وہی دن تھا لچھمن کا لڑکا جو بنواڑی دیکھنے آیا تو گدھی کو بنواڑی میں موجود پایا۔ ڈنڈے سے مارتے ہوئے باہر تک لے آیا۔ گدھی اونچی زمین سے نیچے آنے لگی عین اسوقت ایک ڈنڈا پورا بیٹھ گیا۔ اور وہ کوئی دو تین گز لنڈھکتی ہوئی پانی میں گر گئی۔ دھوبیوں کی ہمدردی گدھی کے ساتھ تھی مگر دوسرے کے معاملے میں لڑائی کون مول لیتا۔ ان لوگوں نے گدھی کو پانی سے گھسیٹ کر کنارے الدیا اور دبی زبان سے کچھ گالیاں دینے لگے جو تھیں تو لچھمن کے لڑکے پر لیکن اگر وہ شکایت کرتا تو الفاظ ایسے تھے کہ دھوبی لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہم لوگ تو اجیالی اور اسکی گدھی کو کہہ رہے تھے اگر تنبولی کا لڑکا بحث پر تیار ہو جاتا تو الفاظ میں لڑائی کی

ابھی گنجائش تھی مگر لڑکا کچھ نہ کچھ اپنی زیادتی پر نادم تھا۔ اس وجہ سے بات ٹل گئی۔ وہ گدھی کسی نہ کسی طرح رینگ کر شام تک تھان پر پہنچ گئی۔ مگر جانبر نہ ہو سکی اور تیسرے دن مر گئی۔ دھوبن زمیندار کے پاس آئی۔ زمیندار نے لچھمن کو بلایا۔ اگرچہ اسے دو روپیہ دینا کھٹکی اچھا لگتا ہے مگر لچھمن نے نہایت خوشامد سے کہا کہ سرکار جو فیصلہ کر دیں عذر نہ ہوگا۔ زمیندار نے چار روپیہ دھوبن کو دلوائے لیکن دھوبن نے چلانا شروع کیا۔ میری گدھی دس روپیہ کی تھی دھوبن کی یہ زیادتی کسی کو بھی پسند نہ آئی۔ لچھمن نے نہایت خوشامد سے کہا اچھا ...... اور جو کہو دے دیں مگر چلاؤ مت۔ جب زمیندار نے لچھمن کو اس طرح تیار پایا تو تین روپیہ اور دلوائے اور اپنے خیال میں فیصلہ ختم کر دیا۔

دو تین دن کے بعد پنڈت بر سادت جی لچھمن تنبولی کے وہاں پہنچے۔ پائے لگی آشیر باد کے بعد کہنے لگے۔

پنڈت :۔ ارے لچھمن ای گدھی کا کا ماملہ بھوا۔

لچھمن :۔ مہراج گدھی کا کون ماملہ۔

پنڈت :۔ ارے وہی جون تمرا لڑکا گدھی مار ڈارس۔

لچھمن :۔ ہمرا لڑکا کاہے کا مار ڈالس او تو بہت دن سے بیمار رہی مر گئی۔

پنڈت :۔ سب لوگ کہت ہیں کہ تمرا لڑکا مار ڈالس۔

لچھمن :۔ ارے رام رام لڑکا کاہے کا مار ڈالس۔ مری سمسری اپنی موت سے اوکا مار کے کوئی کا کرتا۔

پنڈت :۔ گدھی تُمری بنو اڑری ماں پڑی کھو ہاں۔ بھار رڈ کا گدھی کا ڈھکیل دیس کھوہاں اور پھر کس ہوت ہے جیو لیب

لچھمن :۔ ارے مہراج او کا تو بہت دِن بیبے اور گدھی تو مری کاہے اَب ہیں۔

پنڈت :۔ تیسر دن مری ہے۔

لچھمن ۔ اب تیسر دن رہا ہو یا چوتھ دن ۔ ل اُو تو ھواں سے اپنے پاؤں چلی گئی رہے ۔ پھر سُنا کہ مر گئی اور او تو پہلن سے ہی بیمار رہے ۔

پنڈت :۔ تو ہتیا لاگ گئی۔

لچھمن :۔ ارے رام رام ای ہتیا کس۔

پنڈت :۔ گؤ سے اُتر کے پھر گدھن ہتیا ہے۔

لچھمن :۔ ارے مہراج ای کا کہت ہتو۔

پنڈت :۔ ہم کہت ہن کہ شاستر کہت ہے۔

لچھمن :۔ تو مہراج ایسا تو کبھوں سُنا نہیں۔ گدھی اور گؤ کیسے برابر ہوئے سکت ہے ای گجب اندھیر تو نہیں سُنا۔

پنڈت :۔ ارے اندھیر کیسا گائے گؤ کھاجات ہے اور گائے گدھیو لچھمن کی بیوی یہ باتیں سُن رہی تھی روتی ہوئی پنڈت کے قدموں پر گر پڑی

پنڈت :۔ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہوئی جئے ہے شاستر ماں سب کچھ ہے

دھرم سے اُدھرم نہ ہو جیہو۔ یہ جا باٹ سے سب ٹھیک ہوئی سکت ہے۔
لچھمن :۔ تو پھر مہاراج تم ہی ٹھیک کرو نہیں تو ہم دونوں اپنے منھ ماں کھیر لگائیے کے گونا اور نکیں جاب۔ (لڑکے کی طرف دیکھ) یو سار تو دھرم مو لیہیں۔
پنڈت :۔ (ہنس کے) ناہیں، تمر ادھرم تھوڑے جائے سکت ہے جبتک ہم جیت ہیں تم اس بات منھ سے نہ نکالو۔ بس تم اتنا جان لیو کہ ہم کا تیم سار تک جائے کا پڑ ہیئے اور جو کچھ کھلا دے ماں لاگے اور ایک گدھی سونے کا دان کرے کا پڑ ہیئے۔ گدھی کہاں بنا دت پھر ہیو روپیہ اہی دے دیو۔

تین سو آدمی نے کھانا کھایا۔ نیو اڑی ختم ہو گئی تین چار ماہ بعد لوگ یہ فیصلہ بھول گئے مگر لچھمن کو اب تک یاد ہے بہت دنوں کے بعد زمیندار نے لچھمن سے کہا ارے لچھمن نیو اڑی تم نے ناحق چھوڑ دی۔ لچھمن نے کہا سرکار اب نہ کہو چار سو روپیہ خرچ کرے کا پڑ سے ہم ٹھگ گئین۔ اب نیو اڑی کا کبھوں نام لئی تو صاحب بچاس نہی مارو۔

کشکول محمد علی شاہ فقیر

چودھری محمد علی

یہ شاہ صاحب میدان ادب کے ایک چابک دست شہسوار ہیں جن کا انداز قلندری کے جامے میں بھی صاف پہچانا جاتا ہے۔

برگ سبز تحفۂ درویش ہیں عجیب حکمت کا نسخہ پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اطبا اس کے لیئے جہاں تک سراہیں بجا ہے۔ پان کا بیڑا اکثر ہندوستان نے اٹھایا ہے سبز پان میں حسب ذیل چیزیں موجود ہیں جن پر زندگی کا مدار ہے اور جن میں تفریح اور تقویت کا سامان ہے، ملاحظہ ہو۔

سبز پان کا پتا

پانی کا جزو	۸۴ء۴	چونا	۰ء۲۳
پروٹین لحمیات جو جسم کی تعمیر کے کام آتا ہے۔	۳ء۱	ریشے	۲ء۳
دہنیت	۰ء۸	فاسفورس	۰ء۰۴
معدنی اجزاء	۲ء۳	لوہا	۵۰ء۷
کاربوہائیڈریٹ اشکر وغیرہ کے اجزاء جو جسم کی بھٹی کا ایندھن ہیں	۱ء۶	کیلوریفک یعنی حرارت حیوانی سو گرام میں	۴۴
		حیاتین الف	نہیں ہے

کروٹین جو حیاتین الف کی کمی کو پورا کرتی ہے۔	۹۶۲ (بین الاقوامی اکائی)
حیاتین ب	نہیں ہے
حیاتین ج	۵

کیلوری یعنی حرارت کی اکائی

فی اونس	۲

ڈلی (چھالیہ)

پانی	۳۱٫۳
پروٹین	۹٫۴
دہنیت	۴٫۴
معدنی اجزاء	۱
ریشے	۱۱٫۲
کاربوہائیڈریٹس	۴۷٫۲
چونا	۰٫۰۵
فاسفورس	٫۱۳
لوہا	۱٫۵
حرارت حیوانی ایک سو گرام میں	۲۴۸
کیروٹین ایک سو گرام میں	۵
حرارت کا جز فی اونس	۷۰

الائچی

پانی	۲۰
پروٹین	۱۰٫۲
دہنیت	۲٫۲
معدنی جزو	۵٫۴
ریشے	۲۰٫۱
حرارت حیوانی کا جزو	۴۲٫۱
چونا	٫۱۳
فاسفورس	٫۱۶
لوہا	۵
حرارت حیوانی فی سو گرام	۲۲۹
حرارت کی اکائی فی اونس	۶۵

لونگ خشک

پانی	۲۳٫۵
پروٹین	۵٫۲

دہنیت	۹ء۸	فاسفورس	۱ء۰
معدنی جزو	۲ء۵	لوہا	۹ء۴
ریشے	۵ء۹	حرارت حیوانی سو گرام میں	۲۹۳
حرارت حیوانی کا جزو	۹ء۷۴	حرارت حیوانی اکائی فی اونس	۸۳
چونا	۱ء۴۴		

کتھا

مل ہے، قابض ہے ۔ چونے کا فساد کہلاتا ہے۔ چونے سے مل کر سُرخ ہو جاتا ہے۔ کیمیاوی اجزا کا پتہ نہیں چلا سوا اس کے کہ ٹینک ایسڈ اس سے نکلتا ہے اور دست پیچش اور آنتوں سے خون آنے میں دیا جاتا ہے۔

چونا

یعنی کیلشیم کی خوبیاں جس ڈاکٹر سے چاہے پوچھ لیجئے۔ ہر کمزور آدمی جس کے پاس ڈاکٹر کو فیس دینے کے پیسے ہیں، اسکے فائدے سے واقف ہے سوا کتھے چونے کے اور سب حساب ہیلتھ بلٹین نمبر ۲۳ گورنمنٹ آف انڈیا مرتبہ ڈاکٹر ایکرائڈ، ایم، ڈی سے لیا گیا ہے۔

(تمباکو اور کتھے کا حساب انسائیکلوپیڈیا برٹینکا سے لیا گیا ہے)۔

بدقسمتی سے تمباکو بھی پان کے ساتھ لکھ گئی ہے اس کا ذکر اس سلسلے

میں نہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی کہانی میں ہے اس حرام زادے آدمی کا مال نکال ڈالو جو عاشق معشوق کو ملنے نہ دیتا ہو۔ اس میں نکوٹین ہوتی ہے۔ جو زہر ہلاہل ہے۔ مگر غنیمت ہے کہ وہ بہت کم ہے اس کا زہر دور کرنے کے لئے مختلف چیزیں اس میں ملائی جاتی ہیں جو ہمارے خیال کے موافق اس کا فاد سمجھی جاتی ہیں، جیسے زعفران وغیرہ، مگر آج کی کیمیاوی ترکیب ان کی قائل نہیں ہے۔ تنباکو میں مختلف رنگ نشاستہ شکر اور نہ معلوم کون کون خاک دھول الابلا ہوتی ہیں۔ اس کا کھانا اس کے پینے سے زیادہ مضر ہے۔ کیونکہ نکوٹین تو دھواں پیدا ہونے کے پہلے ہی جل جاتی ہے اس کا زہر پانی میں ہی مل کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے حقے میں تو ہر طریقے سے کم مضر ہے۔

اگر میں شاعر ہوتا تو گلوریوں کی تعریف میں قصیدہ لکھتا مگر مجبوری ہے۔ پان کی ایک معاشرتی خوبی ہے جس پر اکثر لوگوں کی نظر نہیں جاتی یعنی بار بار منھ چلانے سے آدمی باتیں کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ معاشرتی فائدہ بہت بڑا ہے۔ جیسے بخار میں پاؤں جھانوال کرنے سے مصنوعی گرمی اصلی گرمی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور ٹھنڈے پاؤں گرم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بار بار منھ کی حرکت سے موضوع دماغ میں آنے لگتے ہیں۔ جو لوگ صحبت میں منھ باندھے بیٹھے رہتے ہیں ان کو پان کھلا کر آزمائیے۔ کھانے کے بعد پان منھ کو غذا کی بو سے خوب صاف کرتا ہے۔ پان کھانے سے منھ کے

اندر کے ہزاروں غدود رستے ہیں جن سے ہضم غذا کا کام شروع ہوتا ہے۔ جو بہت مفید ہے۔ چہرے پر خون دوڑتا ہے نہ اس قدر کہ دماغ پر دھکا لگے۔ بلکہ صرف اتنا جو دیکھنے والے میں خوش دلی پیدا کرے۔ کیونکہ صحت اور تندرستی کے آثار دیکھ کر قلب کو سکون ہوتا ہے۔ اعتدال ہر چیز میں ضروری ہے۔ پان کی زیادتی سے منہ کو اگالدان بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے زیادہ پلاؤ کھا جاؤ اور تخمہ ہو جائے۔ دنیا لپ اسٹک کے لئے نہ معلوم کون کون زہریلی چیزیں اور اقتصادی تباہی اکٹھا کرتی ہے۔ ہماری لپ اسٹک یہی گلوری ہے۔ ہاہا اُستاد کیوں کیسی کہی۔

ممبر۔ یوں کہتے، یوں کہتے، یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
بیان۔ جاتا ہے یار کچھ تو بیاں منہ سے بول لے
اے بے نصیب مانع گفتار کون ہے۔
مجنوں۔ بن کے سائل بھی نہ نکلا کوئی کام
در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا
حالی۔ موثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیان ہو

جلال ۔ گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

غالب ۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

حافظ ۔ صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ان کا ہو دار رزیڈنٹ کی بجو کرا ی سے آگے نکل گیا۔ نواب نے کہاروں کو انعام دیا حالانکہ سعادت علی خاں سے یہ زرا تعجب ہے۔ کہار لوگ اس خوشی میں ناچے۔ یہ ناچ کہروا کہلایا۔ یہہ ناچ دلی میں نہ تھا صرف لکھنؤ میں ایجاد ہوا۔ اس کی نے ہے۔

"دِھن دھاگے ناتے نِک۔ دِھن دھا"

"دھا" پر سَم ہے۔

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں   اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
جاگ پڑی میں تو پیا کے جگائے   بھور ہوت جب پیا مورے آئے

اُن نینن میں نیند کہاں ہے — جن نینن میں آپ سمائے

یہ ٹھمری عالی جاہا والا قدر نواب وزیر مرزا (چوٹکھی والے) کی ہے۔ مرحوم نے اس کو تلنگ میں باندھا ہے۔

مدرس صاحب اعتراض نہ فرمائیں کہ صبح کو نیند آگئی تو دوسرے مصرعہ کا دعوے غلط ہو گیا۔ صبح کو ذری سی آنکھ لگ جانا فطرت ہے۔ مثل ہے کہ نیند تو سولی پر آجاتی ہے۔ مگر اس نیند کو نیند کون کہے گا۔

اس محرومی پر نظر کیجئے کہ جس کی وجہ سے نیندیں اُڑ گیئں اسی نے صبح ہوتے جگایا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس نے رات بھر تارے گنے تھے۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نمبر (۲)

نئی روشنی کے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کو پھاگن۔ رُت کی خوشیاں نصیب ہوں، آیئن اس فصل میں دیہات میں فحش گیت گائے جاتے ہیں یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نام فسق
داوری دارم بسے یارب کرا داور کنم

وقت کا تقاضا ہی یہ ہے۔ ارا را را کبیر

"ارے چپ، ارے چپ خبردار جو مُنھ سے کوئی بے ہودہ بات نکالی۔ مردود! اب تو یہاں بیٹھ کر شریف مرد آدمیوں میں کبیر گائے گا۔"

جی۔ کیا ہرج ہے"۔ ارا را را"

پھر وہی۔ اٹھاتا ہوں تمچی۔

دیکھئے دیکھئے، سُن لیجئے، غصہ نہ کیجئے ہاتھ روکے رہئے تو عرض کروں مورخ الفنسٹن نے ہندوستان کی ذہنیت کے سلسلے میں اُس معصوم صاف دلی" کا ذکر کیا ہے جس کے رو سے جو چیزیں بلا اعتراض ہو سکتی ہیں وہ بلا اعتراض بیان بھی کی جا سکتی ہیں ابھی بنتھ جی اُس شاندار قدیم زمانے کا ذکر کرتے

بھی جو گاؤں پنچایتوں کی وجہ سے واپس آکر گذشتہ رونق بڑھاویگا۔ یعنی وہی معصومیت اور صاف دلی پھر جگمگا اٹھے گی۔"

تو اس کے معنی یہ تم نے یہاں سے نکالے کہ تم کبیر گانے لگو۔ لو مارشے، فرانسیسی ڈراماٹسٹ پہلے ہی فرما گیا ہے کہ وہ حماقت انگیز چیزیں جو نثر میں نہیں بیان کی جا سکتیں نظم میں یا گا کر سنائی جاتی ہیں۔"

جی ہاں، تو میں بھی تو لحن سے کلام موزوں کر رہا ہوں۔ ارارارا۔ چٹ پٹ دھم۔ اچھا مولوی صاحب معاف کیجئے اب کبھی نہ گاؤں گا۔"

(برٹرنڈ رسل کی ایک تقریر کا خلاصہ جو وہ یوربین لسنرز سروس میں براڈکاسٹ کیا تھا اقتباس از ورلڈ ڈائجسٹ جون ۱۹۴۷ء۔)

الفاظ کے دو کام ہیں واقعات بیان کرنا اور جوش دلانا۔ دوسرا کام زیادہ قدیم ہے، جیسا کہ بچہ دینے کی فصل میں جانوروں میں ظاہر ہوتا ہے۔ تہذیب کی کوشش ہے کہ الفاظ معنی زیادہ بیان کریں اور جوش کم دلائیں۔ مگر پالیٹکس میں اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ گو الفاظ کے معنی لغت میں متعین ہیں مگر پالیٹکس میں آکر بدل جاتے ہیں۔ اسی لفظ کے معنی مختلف خیال کے لوگوں کے نزدیک مختلف ہوتے ہیں۔ مگر جوش لانے میں ایک ہی طرح کام آتے ہیں۔ آزادی کے معنی ہیں "غیر کی حکومت کا فقدان"۔ پھر اس کے معنی ہو گئے بادشاہ

کے اختیارات میں کمی "۔ جب انسانیت کے حقوق کا مسئلہ نکلا تب اسی لفظ "آزادی" کے معنی ہو گئے۔ "کن کن باتوں میں گورنمنٹ کی حکومت سے آدمی آزاد ہے"۔ پھر ہیگل کے وقت میں آکر اسی لفظ کے معنی ہو گئے کہ آزاد آدمی کن کن باتوں میں اپنی مقرر کردہ پولیس کا حکم مانے گا۔ آج کل لفظ "ڈیماکریسی" بھی اسی طرح سے برن بدل رہا ہے پہلے اس کے معنی تھے "جمہور کی حکومت" اور اس کے ساتھ فرد کی آزادی کا بھی کچھ خیال شامل تھا۔ پھر اس کے معنی ہو گئے غریبوں کی حکومت کیونکہ غریب ہی ہر جگہ زیادہ تھے۔ پھر اس کے معنی نے نیا چولا بدلا۔ اور اس کے معنی ہو گئے "غریبوں کے نمائندوں کی رائے" فی الحال اس لفظ کے معنی مشرقی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں میں قرار پائے ہیں کہ اُن لوگوں کی جمہوریہ حکومت جو کبھی غریبوں کے نمائندے تھے اور اب ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ دولت مندوں کو کھا جاؤ۔ سوا ان دولت مندوں کے جو ڈیماکریسی کے تازہ ترین معنی کو تسلیم کرتے ہیں "۔ لفظوں کے معنی بدلتے جائیں۔ مگر الفاظ کا اثر وہی ہونا چاہیے جو اصلی معنی کا ہوا تھا۔ بدلے ہوئے معنوں سے پولیٹکل جھپٹ چھاپئے پن کو اچھی خاصی مدد ملتی ہے۔ الفاظ کے نت نئے معنی کے ذریعے سے اُن لوگوں کو چاند میں ہوا کے ذریعے سے آدمی بھیجنا ہو تو یہ رضا کار یہ کہہ کر پکاریں گے کہ "وطن، وطن مالوفہ، وطن مالوفہ کو کون چلتا ہے"۔ یعنی

سلوگن وہی رہے گا، مگر مفہوم بدلتے رہیں گے اور کام چلتا رہے گا
سائنس اور سائنٹیفک فلاسفی کی تعلیم میں صحیح معنی پر ٹرا زور دیا جاتا ہے
لڑکوں کو پڑھانے میں بھی اس کا پورا خیال رکھا جانا چاہیئے کہ نہ لفظوں
کے معنی حسب ضرورت بدلے جا سکیں۔ نہ اُن کا اثر الٹا ڈالا جا سکے
اور اس طرح تعلیم صحیح صورت میں پیش نظر رہے۔ میرا تجربہ ہے کہ
سائنٹیفک فلاسفی کی تعلیم اس احتیاط کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے
اور اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر اس کو کامیابی سے برت بھی لیتی ہے
(مگر پولیٹیکل میدان میں وہی جذباتی معنی پیش پیش رہتے ہیں۔)

لڑائی شروع ہونے کے پہلے ایک سائنٹیفک فلاسفی کا جلسہ برلن
میں ہوا تھا، جہاں تمام ممالک سے بڑے پڑھے لوگ جمع ہوئے تھے
ان کی گورنمنٹیں ایک دوسرے پر اعتراض اور سخت گیری جیسا کہ دُنیا
کا قاعدہ ہے کرتی ہی رہتی تھیں۔ مگر یہ لوگ نہ صرف علمی ہی معاملات
پر صحیح رائے قائم کر لیتے تھے۔ بلکہ ملکی جھگڑوں، آپس کی اُکھاڑ
پچھاڑ۔ ردو قدح کے نظریوں پر بھی دو ٹوک رائے قائم کر لیتے تھے۔
اگر یہی لوگ عام ممالک کے کابینوں میں وزارتیں پا جاتے تو
شاید سب معاملات سلجھ جاتے مگر پولیٹیکل چالیں اور ایمانداری
الگ الگ چیزیں ہیں۔ بدقسمتی سے مدرسوں میں ایسی تعلیم

نہیں دی جاتی۔ وہاں تو اس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے کہ سیاسی جوش بڑھے لغت اور ایمانداری چاہے بھاڑ میں جائے مثال کے طور پر سُن لیجئے۔ آیا۔ آئرلینڈ کو یہ حق ہے کہ وہ برطانیہ سے علیحدہ ہو جائے؟ امریکہ کا ہر ریڈیکل کہے گا "ہاں" آیا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ دس میں نو ریڈیکل کہیں گے "نہیں"۔ میں یہ نہیں کہتا صرف نظریہ ہی معاملات کو سدھار سکتا ہے، نہ صرف جوش ہی سدھار دے گا۔ لیکن اس نظریے کی تطبیق ایمانداری سے واقعات پر ضرور صحیح نتیجے پر پہنچا دے گی۔ اگر عام دنیا کے اسکول ایک بین الاقوامی ادارے کے تحت میں کر دئے جائیں۔ تو یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نمبر (۳)

مغنی آتش نفس بلبل ہند سروجنی نائیڈو کی ایک نظم گولڈن تھریشولڈ، کے ایک بند کا ترجمہ سنیئے :۔

آؤ ہم تم مل کر مارچ کی صبح کا لطف اُٹھائیں۔ فضا میں گرمی ہے تیزی اور تندی ہے، جوش اور ولولہ ہے۔ کائنات کی ہر شے بے دھڑک بے جھجک سرخوشی کے عالم میں زندگی کے اور محبت کیلئے مچل رہی ہے۔"

بلیک انگریزی شاعر کی ایک نظم جو تقریباً اٹھارھویں صدی کے آخری دہاکے میں رکھی گئی ہے۔ یہ بالکل ہی موجودہ نسل کے حسب حال ہے۔ میں نے یہ نظم لکھنو کے۔ ایک بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے شاعر سلمہ اللہ تعالےٰ کو بھیج دی۔ موصوف نے لفظی ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ اور دو شعر اسی رنگ میں اور جوڑ دیئے تاکہ اُردو میں کچھ مطلب اور واضح ہو جائے۔

ڈیڑھ سو برس کی نظم اور اس میں ڈاکٹر زیگمنڈ فرائڈ اور ینگ کا رنگ! معلوم ہوتا ہے کہ تحلیل نفسی کی عمارت کا پتھر بلیک ہی نے رکھا تھا اس جاودانی میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ اب اس نظم کا نظام

حسب ذیل ہو گیا۔ پہلے بلیک کا ترجمہ اس کے بعد ایک شعر اُستاد مدظلہ العالی کا پھر دس اشعار ایک نوسکھیے کے پھر آخری شعر ایک ذرا سے تصرف کے ساتھ اُستاد کا۔ لیجئے۔ سنئے۔

بلیک

مری ماں درد سے چلاتی تھی روتا تھا باپ
میں جب اس دہر پر آشوب میں کودا ناچار
چیتھڑا تن پہ تھا کرتا تھا ٹھنوں ٹھنوں
بدلی کی اوٹ سے شیطان کی جیسے للکار
جب لیا باپ نے ہاتھوں میں تو مچلا کیا
تا کہ آزاد ہو جسم کہ بند سے ہوں کپڑوں کی
تھک گیا اور یہ سوچا کہ یہی بہتر ہے
ماں کی چھاتی پہ پڑے رہیے اُداس اور خفا

اُستاد

ابتدا تھی یہی شاید مری سرتابی کی
قید ہر قسم کی ہے فطرت انساں پہ گراں

نوسکھیا

ضد اِدھر روک اُدھر پڑ گئی بنیاد عیوب

عیب جنسی ہوں کہ ہوں دوسرے پہلو کے عیاں
عذر معقول فرائڈ نے گناہوں کے دیئے
کر دیئے پیش ہوئے جس سے خلائق شاداں
اثم و عُدوان سے گر، اب بھی کوئی شرمائے
لوگ ہنس ہنس کے کہیں اس کو کہ ہے یہ ناداں
اک طرف جوش حیات آدمی کو اُکسائے
دوسری سمت سے شاباش پکارے شیطان
فلسفی عذر و وکالت کے لئے حاضر ہے
اور سائنس کرے روگ کی سختی آساں
ہے مزا یوں تو گناہوں کے سبھی شعبوں میں
عشق کا لطف مگر اور گناہوں میں کہاں
ہے ذری سخت مگر قید حلال اور حرام
"اُنہ" سے کچھ خیر نکل جاتا ہے خوف یزداں
کہ حقیقی و مجازی میں ذری گھال میل
پھر تو ہے صاف ترے شوق کے خاطر میداں
لے تصوف سے مدد فلسفہ و منطق سے
دے ثبوت اس کا کہ ہے زیست سراسر تاواں

پھاند پھر جوک کے دریا میں شناور ہے اگر
احتیاط آرہے یہ شعر مگر وردِ زبان
اُستاد (بہ خفیف تصرف)
قید دُنیا میں رہے قید محبّت ہر دم
یہ نہ ہو تو کبھی انساں نہیں بنتا انساں۔

روس کی پالیسی کے اوپر ایک مرتبہ چرچل نے ایک جملہ کہا تھا، اس کا ترجمہ نئی روشنی کے ایڈیٹر کی تتبع میں کیا گیا تھا۔ جھمیلے کے میلے ہیں۔ گڑبڑ جھالے کا بازار ہے۔ گورکھ دھندوں کا بیوپار ہے۔"

مسلمان، یہود، نصاریٰ اور ستارہ پرست ان میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے۔ بے شک یہ لوگ اپنے رب سے اپنا اجر پائیں گے، نہ ان کو کچھ خوف ہوگا نہ کچھ غم ہوگا۔ یہ آیت (۶۲) باسٹھویں آیت آٹھویں رکوع پر سورہ بقر میں ہے۔ اور پھر یہی آیت بہترویں (۷۲) آیت آٹھویں رکوع پر سورۂ مائدہ میں ہے اور پھر یہی آیت کچھ اختلاف معنی اور الفاظ کے ساتھ سورۂ حج میں سترھویں (۱۷) آیت ہے۔ اس آیت کے منسوخ ہونے کا

گمان بھی نہیں ہے، کیونکہ سورۂ مائدہ جہاں تک خیال پڑتا ہے
تنزیل کی رو سے آخری سورۃ ہے۔ اور پھر یہ آیت بہ تکرار
آئی ہے۔ اس آیت کے سلسلے میں لوگ پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور
آج عبداللہ ابن یوسف علی نے "صابئین" کی بڑی تحقیقات کی ہیں۔
اس کے بعد لکھتے ہیں کہ باوجود سے کہ بہت سے مفسرین اختلاف کر گئے
لفظ "صابئین" کے معنی ہیں از روئے قیاس نیک نیت زردشتی
وید کے ماننے والے۔ بودھ کنفیوشس اور دوسرے اخلاق کے معلمین
کے پیرو بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔

سوات

آبادی دس لاکھ، پہلے والی کا نام عبدالودود رقبہ ۴ ہزار میل
مربع۔ سنہ ۱۹۰۷ء مالاکنڈ کی لڑائی میں لڑتے لڑتے ایک لایت کا ڈھانچہ
تیار ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں حکومت قائم ہو گئی ٹیلیفون، بجلی تعلیم سب ہی
کچھ ہو گیا۔ عبدالودود ان پڑھ تھے، اور شائد آج بھی ویسے ہی ہوں۔

دوا

بوا رحمانی کے یہاں زمینداری تو کبھی نہ تھی مگر گاؤں میں آبرودار گھر سمجھا جاتا تھا۔ دو ہل کی سیر ہوتی تھی اور عورتیں پردے دار تھیں۔ بھرا پرا گھر تھا ان کے شوہر ہمت خاں کی توقیر گاؤں میں کسی سے کم نہ تھی۔ گاؤں پٹی داری کا تھا جس میں حصہ دار قبضے دار ما تحتی والے سبھی رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ برابری کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگر ان کا گاؤں کسی بڑے علاقے میں شامل ہوتا تو رعایا سب برابر اور تعلقدار نائب صاحب اور ضلعدار سب کی حکومت اٹھاتے اٹھاتے لوگ محکومی کے زیادہ عادی ہو جاتے۔ ان کا گاؤں ایسا نہیں تھا۔ چھوٹے زراعت پیشہ کو بنتے بگڑتے کچھ دیر نہیں لگتی دو فصلیں اچھی ہو گئیں۔ اناج سے گھر بھر گیا، لگان بھی نکل گیا۔ پرانے بیلوں کی جگہ نئی گوئی بھی آ گئی اور اپنے ہم چشم عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایک فصل خراب ہو گئی تب بھی صاحب لیکھا ڈیوڑھا برابر ہو گیا۔ اگر کہیں دو فصلیں تابڑ توڑ بگڑ گئیں تو کسان ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں خدانخواستہ کوئی بیماری حیرانی پڑ گئی یا کوئی مقدمہ اٹھ کھڑا ہوا تو فاقے کی نوبت آ گئی

اور گھر بار چھوڑ کر دیس پردیس نکل گئے۔ نہیں تو دو تین برسوں میں پھر حالت سنبھل گئی اور کام چلنے لگا۔ ہمّت خاں کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ بڑا لڑکا سولہ سترہ برس کا تھا۔ لڑکی کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ چھوٹا بچہ سات سال کا رہا ہوگا۔ رحمانی کے یہاں بچے تو آٹھ ہوئے مگر جیے تین ہی باقی کوئی چیچک میں کوئی سوکھے میں یا اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں جن میں حفاظت ہوسکتی تھی مگر نہیں ہوئی مرتے گئے گاؤں میں ایسی عورتیں بھی تھیں کہ جن کے بچے تو بہت سے ہوئے مگر جیا ایک بھی نہیں۔ ان کے دیکھتے رحمانی اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھیں اور اللہ کا شکر بھیجتی تھیں۔ زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ اسی کو اہل جہاں انقلاب سمجھتے ہیں۔ ایک سال گاؤں میں ہیضے کی بیماری آئی جس میں ہمّت خاں کا انتقال ہوگیا۔ رحمانی نے بڑے بیٹے کی مدد سے کھیتی باڑی سنبھالنے کی کوشش کی مگر پردے کی وجہ سے کام بگڑتا ہی گیا باہر جاکر پردہ چھوڑ دینا ممکن تھا مگر اپنے گاؤں میں رہ کر یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ بڑا لڑکا بھی کچھ بیمار رہنے لگا۔ کھٹ کھٹ کھانسی تو گذشتہ جاڑوں ہی سے آتی تھی اب تو تیسرے پہر کو حرارت بھی رہنے لگی رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ کھیت بے جوتے بوئے پڑے

رہنے لگے۔ کچھ تنکمی اٹھا دئے کچھ جھوٹ موٹ ہوئے بھی گئے تو بسا رہ
بھی مشکل سے نکلا۔ خاتون نے بڑے لڑکے کی بیماری اور بڑھا دی گاؤں سے
دس کوس پر ایک بڑا قصبہ تھا جہاں حکیم ڈاکٹر اور سرکاری شفا خانہ سب
ہی کچھ تھا۔ وہیں رحمانی کی خالہ زاد بہن رہتی تھی۔ جو کسی رئیس کے یہاں لگ گرتھی۔
رحمانی نے علاج کے بہانے وہیں چلے جانے کا ارادہ کیا۔ اڑوسیوں پڑوسیوں
سے روز روز قرض مانگتے مانگتے تھک گئی تھی کہاں تک مانگتی کسی سے آٹا کسی سے
دال کہاں تک اُدھار لے۔ اگر گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تو زمیندار
کا پیادہ لگان بھی مانگنے روز سر پر نہ کھڑا رہے گا۔ لڑکے کا بھی
علاج ہو جائے گا۔ گاؤں میں سوا نیم کے سینکوں کے اور دوسری
دوا نہیں تھی۔ ایک دن اللہ کا نام لے کر چل کھڑی ہوئی۔
قصبے میں آ کر پتہ چلا کہ لڑکے کو بڑی بیماری ہے پہلے حکیم صاحب
کا نسخہ پلایا۔ پھر خیراتی ہسپتال سے دوا آنے لگی مگر مرض بڑھتا
گیا جوں جوں دوا کی اور تھوڑے دنوں میں چار پائی سے لگ گیا۔
ایسے بیمار کو کون گھر میں رکھتا مگر رحمانی کی بہن نے نکالا نہیں البتہ
بیمار کے برتن الگ کر دیئے۔ رحمانی کی خالہ زاد بہن ایسی خدا ترس
کہاں تھیں کہ بال بچوں والا گھر رکھا کر ایسے بیمار سے گھبراتیں نہ
مگر وجہ یہ تھی کہ رحمانی کی لڑکی کو اپنے لڑکے کے ساتھ کرنا چاہتی

تھیں اسی کی خوشامد تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی رئیس کے یہاں نوکری کرنے کے بعد رحمانی کی لڑکی کا پیغام دینے کی جرأت بھی نہ پڑتی۔ آج یہ دن تھا کہ وہی رحمانی خود اُن کی نگاہ دیکھتی تھیں۔ اللہ جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے۔ لڑکی کا سن بارہ تیرہ برس کا تھا۔ پڑھے لکھے خوش حال لوگوں کے یہاں یہ سن کھیلنے کا ہے۔ غریب اگر اپنی لڑکی کا بیاہ کرکے ذمہ داری دوسرے پر نہ ڈالنے کی کوشش کرے تو کیا کرے رحمانی کا لڑکا گرمیوں میں صاحب فراش ہو چکا تھا۔ ساون کے مہینے میں ختم ہو گیا۔ اتنی لمبی بیماری اور بیمار کی تکلیف دیکھ کر ہر شخص کے دل میں آتا تھا کہ اللہ اُس کی مشکل آسان کرے۔ اس دعا میں ماں بھی شریک تھی۔ مگر ایسی بات کون ہندوستانی ماں مُنھ سے نکال سکتی تھی۔ انتقال کے بعد رحمانی نے بَین ایسے کئے کہ ہر شخص کے دل پر چوٹ لگی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ہمدردوں نے اصرار کرکے غریب کو کھانا کھلایا۔ لڑکے کے انتقال کے پہلے نہ معلوم کئے وقت فاقہ کیا تھا۔ اس وقت بھی کھانا کیا اچھی طرح کھایا جاتا مگر جب تک دنیا میں آدمی ہے بغیر کھائے چارہ نہیں لیکن اس وقت میں بھی بَین ایسے کئے کہ سننے والے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اس باضابطہ رونے میں کتنا رونا رواج

کا تھا کس قدر دل کے تقاضے کا اور کس قدر دماغ کے اشارے کا۔ اس کو اللہ ہی جانتا ہے۔

رحمانی مصیبت میں گھر سے نکلی تھی اُس کے پاس تھا ہی کیا؟ جو تار پھلّا رہا بھی ہوگا۔ وہ لڑکے کی بیماری میں اُڑ گیا۔ اب خانۂ رسول اللہ تھا۔ جس چیز کا خیال گھر پر خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ اور جس کو یہاں آکر مُنھ سے نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی وہ سامنے آئی یعنی رحمانی ماماگیری کرنے پر تیار ہوگئیں اور لڑکے کے سیوم کے بعد مُنھ پھوڑ کر بہن سے کہہ بھی گذریں۔ بہن نے کہا اس کی فکر ہو جائے گی۔ مگر جو ان لڑکی کو کیونکر ساتھ لے جاؤ گی جو اُن کے دل میں تھا وہی اُن کی خالہ زاد بہن کے دل میں تھا۔ قصہ مختصر لڑکے لڑکی کی نسبت ہو گئی اور دو بول شرع کے بھی ہو گئے۔ گھر میں اتنی بڑی موت ہو چکی تھی اگر پیسہ ہوتا بھی تو ڈھول کیونکر رکھی جاتی لیکن اُن کی سمدھن نے بھی اتنا لحاظ کیا کہ گانا وانا نہیں ہوا۔ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہو کر رحمانی نوکری کرنے نکلیں اور رحمانی سے بوا رحمانی ہو گئیں۔ یہ تو ماماگیری کرنے پر تیار تھیں مگر تقدیر کی اچھی تھیں۔ ایک بڑے گھر میں کھانا پکانے پر نوکر ہو گئیں۔ بہت بڑی سرکار تھی۔ باہر کا باورچی خانہ جُدا تھا اندر کا کارخانہ جدا۔ نوکروں چاکروں کی کثرت تھی اندر باہر ملا کر خدا

جھوٹ نہ بلاوے پچاس ساٹھ آدمیوں کی روٹی رہی ہوگی۔ نوکر تو پھر نوکر لیکن اتنا غنیمت تھا کہ ماماگیری کی ذلت سے بچ گئی تھیں۔ زمانہ گذرتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ قصے کہانی میں تو کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ دس برس ایک سطر سے دوسری سطر پر نگاہ دوڑاتے گذر جاتے ہیں۔ اتنے زمانے میں بوا رحمانی کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دیہات کا گھر کھیتی باڑی۔ وہاں کا رہنا سہنا پچھلے جنم کی باتیں ہو گئیں تھیں۔ اُس کے بجائے صاف ستھرا چھوٹا سا گھر رئیس صاحب کی مدد سے لعد انھیں کی زمین پر بن گیا تھا۔ گھر میں گرستی بھی حیثیت کے موافق ہو گئی تھی۔ بوا رحمانی ادھیڑ عمر میں تو آئی ہی تھیں اب اچھی خاصی بوڑھی ہو گئی تھیں پہلے دُبلی تھیں اب بلغم نے بھاری بھرکم بنا دیا تھا۔ ناک میں کیل تو پہن نہیں سکتی تھیں۔ مگر ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے اور اور بتانے گلے میں جھالردار طوق اطمینان کا پتہ دیتے تھے۔ سونے کی بجلیاں بھی بنوائی تھیں مگر وہ بہو کے لئے رکھی تھیں۔ ساتھ کی ماما اصیلوں نے کہا بھی کہ بوا کان میں ڈال لو اپنے جیتے جی بہو کو کیوں دوگی تمھارے بعد تو اُس کا ہے ہی۔ اس سے ذرا بہو پر رعب رہے گا اور تابعدار رہیگی۔ مگر رحمانی نے نہ پہنا۔ اللہ وہ دن بھی لایا کہ بوا رحمانی بہو بیاہ کر لائیں مگر اپنے قدیم دیہاتی اعزا کو نوید نہیں بھیجی اور نوید بھیجتیں بھی تو شاید وہ نہ آتے۔

وجہ یہ تھی کہ جس لڑکی سے اُنھوں نے لڑکے کی نسبت کی تھی۔ اُسکی پرورش ایک دوسرے رئیس کے گھر میں ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کسی زمانے میں اُسی طرح رانڈ دکھیا دیہات سے آکر دودھ پلانے پر نوکر ہوئی تھی۔ پہلا ہی لوکا گودیں تھا۔ نوکری کے بعد اُس کو کافی دودھ نہ مل سکا اور وہ دُبلا ہوکر مرگیا۔ قاعدہ کے موافق انّا کا لڑکا اوپر کا دودھ پاتا تھا چوری چھپے کسی وقت انّا بھی پلا دیتی تھی اگر کسی نے نہ دیکھا تو خیر۔ اگر دیکھ لیا تو آفت آتی تھی۔ جس لڑکے کو انھوں نے دودھ پلایا تھا۔ اس کی دودھ بڑھائی کے بعد یہ کچھ معطل سی ہوگئیں۔ گو گھر میں عزت توقیر وہی رہی جو ہونا چاہیئے تھی۔ مگر دھندا کم ہو جانے سے خیالات کچھ اچاٹ رہنے لگے جو وقت بچے کی خدمت میں صرف ہوتا تھا وہ بناؤ سنگار میں گذرنے لگا۔ دودھ بڑھ جانے کی وجہ سے پرہیز کی بھی تقید اُٹھ گئی تھی۔ مرچیں کھانے کو زبان ترس گئی تھی کھٹاس کا مزا خوب ہو گیا تھا وہ پھر لوٹ آیا۔ کچالو چٹ پٹے اور چنے جور گرم کا چٹخارہ بھرا جانے لگا۔ کپڑے اور زیور تو انّاؤں کے پاس اچھے ہوتے ہی ہیں اُن کے پاس بھر دل جوانی کا بھی خزانہ تھا۔ جوانی میں دانت نکال کر طاق پر رکھ دو تب بھی نکلے ہی رہیں گے۔ یہی حال انّا کا تھا کسی مرد سے آنکھیں چار ہوئی نہیں کہ ہونٹوں کی کلی بکس گئی۔ اسی زمانے

میں بیگم صاحبہ نے ایک آدھ مرتبہ رئیس صاحب کو بھی آنکھیں ملاتے اور انّا کو مسکراتے دیکھ لیا۔ آدمی بڑی سمجھدار تھیں۔ بجائے اس کے کہ سوئی کا بھالا بناتیں۔ بات کا تبنگڑ کرتیں مہنا مت ڈالتیں۔ گھر کا پالا ہوا ایک لڑکا تھا اُنھوں نے اُسی کے سر انّا کو تھوپ دیا۔ لیجئے صاحب اُس کا بھی گھر آباد ہو گیا اور قاضی صاحب نے اپنی عنایت سے آئندہ اور گذشتہ تہمتوں کا دروازہ بھی مسدود کر دیا۔ مجال ہے کہ شوہر دار عورت پر کوئی دھر رکھ سکے یا باندھنو باندھے۔ مگر سال کے اندر ہی لڑکی پیدا ہوئی۔ حساب لگانے سے بیاہ کے آٹھ مہینے ہوتے تھے۔ اب کیا تھا عورتوں اور عورت مزاج مردوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آگیا جہاں سنئے اسی کی باتیں ہوتی ہیں کہیں غصہ ہے کہیں ہنسی ہے کہیں تعجب ہے کہیں کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا جارہا ہے، توبہ توبہ، کہیں ماتھا کوٹ کر کہا جاتا ہے، اللہ ہر آفت سے بچائے کہیں ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اوئی بہن یہ کیا ہوا کی آواز آتی ہے۔ کوئی چار دن کے بچے میں رئیس صاحب کی مشابہت دیکھ لیتی ہے کوئی پہلے ہی سے سر پر پورے بالوں کا ذکر کر کے کہتی ہے اٹھواسی تو ہو نہیں سکتی۔ ایک متشرع بزرگ شوہر کو بزرگانہ صلاح دے رہے ہیں کہ بیٹا پھر سے نکاح پڑھوا لو۔ قصہ مختصر جتنے منھ اتنی زبانیں جتنی

زبانیں آتنی باتیں۔ ہر شخص اپنی چھوڑ پرائی بات طے کرنے پر تیار تھا۔
اگر یہ دیہات میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کا نام کوئی رسولن۔ امامن
وغیرہ ہوتا یہاں اس کا نام جوہی خانم رکھا گیا۔ یہی لڑکی تھی جس کے
ساتھ بوا رحمانی کے لڑکے کی شادی ہوئی تھی۔ بوا رحمانی نے بہو نہایت
سلیقہ کی پائی۔ سینا پرونا۔ کھانا پکانا۔ ہر چیز میں بے مثال تھی گھر کے
انتظام میں صفائی، کفایت شعاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی
آنے جانے والوں سے برتاؤ۔ اُن کی خاطر مدارات میں اپنی حیثیت سے
کہیں بڑھ کر کام کرتی تھی اور گو بڑے لاڈ پیار کی پالی ہوئی تھی اور جس گھر
سے آئی تھی گو وہاں نوکر چاکر اُس کی قدر منزلت نہ معلوم کس وجہ سے
نوکروں کی دوسری لڑکیوں سے زیادہ کرتے تھے پھر بھی یہ سسرال
میں ہر طرح کی کڑی جھیلنے کو تیار رہتی تھی۔ بوا رحمانی جہاں نوکر تھیں
وہاں کے نوکر چاکر مختلف موقعوں پر ان کے گھر آنکلتے تھے اور
ہر شخص کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ بوا رحمانی کی بہو کی ہر طرف واہ واہ تھی۔

اب وہ باتیں بوا رحمانی کے لڑکے کی بابت سُن لیجئے۔ اُن کا نام
دائم خاں تھا۔ بوا رحمانی کی سرکار میں یہ بھی رہتے تھے۔ پہلے چلم وغیرہ
بھرتے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو پھر خدمت گاری کرنے لگے مگر
اوروں کی طرح تنخواہ اُن کی نہ مقرر ہوئی گو مہینے میں تنخواہ سے زیادہ

پا جاتے تھے غیر ذمہ داری کا کام رفتہ رفتہ مٹرگشت زیادہ اور کام کم کرنے لگے۔ عمر بھر یہی رہا کہ گھر کا خرچ اسی سرکار سے چلا کیا۔ وقتاً فوقتاً کام بھی کیا کئے مگر مقررہ تنخواہ کبھی نہیں پائی ایسے لوگوں کو لواحق کہتے ہیں۔ آدمی نیک تھا مگر بے وقوف، نوکروں میں ایک کہاوت ہے۔ "جس کی بڑھیا محل کے اندر اُسکا طالع بڑا اسکندر" بچپن سے پکے پکائے عمدہ کھانے کے عادی رہے مزے سے مزے کی چیز جو گھر میں پکی اُسمیں اُن کا حصہ ضرور لگا اوپر کا نہ بھی ہنڈی کا شوربہ تو اُن کا کہیں گیا نہ تھا بغیر محنت کئے کھانے کی سزا چھوٹے بڑے ہر شخص کو ملتی ہے۔ انہیں کیا سرخاب کے پر لگے تھے جو بچ جاتے اسی وجہ سے کاہل بھی ہو گئے تھے۔ غریبوں کے لڑکوں کا دستور ہے کہ دس ہی بارہ برس کی عمر میں یا اپنے آبائی یا کسی نہ کسی دوسرے کام پر لگا دئے جاتے ہیں بعض اسی وقت سے کرنے لگتے ہیں بعض جب مصیبت پڑتی ہے تب کرتے ہیں۔ لیکن ماں باپ کوشش یہی کرتے ہیں کہ کام کرنے کی عادت شروع ہی سے پڑ جائے میاں دائم خاں کو ان کی ماں نے اس ڈھرے پر نہ لگایا۔ اسی طبقے کے دوسرے لڑکے جب دوپہر کو کام پر سے لوٹتے تھے تو موٹا جھوٹا جو کچھ ملا بے تابی میں کھا گئے، بھوک کی شدت نے شکوے شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ میاں دائم خاں کی یہ عادت پڑی تھی کہ گھومنے پھرنے کے بعد جب دوپہر کو لوٹے تو جو ڈالی ماں سرکار سے لے کر آئی ہیں۔

سامنے رکھ کر کھانے لگے۔ اگر کسی دن سالن کم بچا تو جائزہ لیتے ہی وہیں سے شکوے کے انداز میں پکارتے اور اماں اس میں تو ہڈی ہی ہڈی دکھائی دیتی ہے۔ بوٹی تو ہے ہی نہیں" ماں نے کہا کھا لو نہیں بچی تو میں کیا کرتی وہ دیکھو طاق پر کاغذ میں لپٹی ایک برفی کی ڈلی رکھی ہے وہ کھا لینا۔ اس کے بعد دائم چپ چاپ کھا کر باہر چلے جاتے تھے۔ حق بات کہنا چاہیے۔ کھانا چاہے اچھا ہو چاہے برا میاں دائم خاں اس معاملے میں مذکورہ بالا شکایت سے زیادہ کبھی نہیں کرتے تھے۔

شادی کے بعد ایک نئی آفت نازل ہوئی یعنی نہ فاتح کے اوپر فتحمندی کے آثار دکھائی دیئے نہ مفتوح پر فتح ہو جانے کا وہ اطمنان جھکا جو تسلط کے بعد ہوتا ہے۔ آٹھ دس دن تو بات چھپی رہی مگر رفتہ رفتہ یہ راز دائم خاں کی سسرال سے کھلنا شروع ہوا۔ بوا رحمانی بہت گھبرائیں بیٹے کو حکیم صاحب کے پاس لے جانے کو تیار ہوئیں۔ لڑکا پہلے تو جانے ہی سے انکار کرتا رہا۔ اس کے بعد مجبوراً گیا حکیم صاحب نے وہی سوالات کئے جو دوا والوں کے اشتہاروں میں دیکھے جاتے ہیں اور یہی سبب مرض کا ٹھہرایا۔ بھنگی کا نسخہ لکھ دیا کہ صبح کو گائے کے دودھ کے ساتھ پیو۔ کئی روپے کا حلوا بنا دیا۔ جب اس سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا

تو کہا ذرا سردی اور پڑنے لگے تو علاج شروع ہو گا۔ اب یہ راز پوری طور سے افشا ہو چکا تھا۔ ساتھ کے نوکروں چاکروں نے دائم خاں سے صاف صاف پوچھنا شروع کیا۔ دائم خاں کبھی جزبز ہوئے کبھی شرمائے کبھی ہمدردی کا اظہار پا کر کہنے لگے "یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے ایسے تو ہم اچھے ہیں مگر وہاں پہنچ کر نہ معلوم کیا ہو جاتا ہے حکیم صاحب نے کہا ہے کہ جب ناقص مواد نکل جائے گا تو اچھے ہو جائیں گے۔ دیکھو بھائی کیا ہوتا ہے۔"

بوا رحمانی اپنی پریشانی میں دائم کو لے کر لکھنؤ بھاگیں۔ ایک بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ اُس نے حال سُن کر کہا یہ روحانی شکایت ہے جس کو غلطیوں سے کوئی واسطہ نہیں ممکن ہے غلطیوں سے کچھ بیماری زیادہ ہو گئی ہو مگر اصل وجہ روحانی ہے۔ اس علاج میں دیر لگے گی اور یہاں رہنا پڑے گا۔ بوا رحمانی کے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ روپیہ۔ ناچار نسخہ لکھوا کر واپس آئیں۔ اس کے بعد پھر سے حکیم صاحب کا علاج شروع ہوا پھر میاں دائم خاں عطائیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ نہ معلوم کتنے زخم ڈالے گئے کتنا خون مواد ہو کر بہہ گیا۔ مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ تقریباً دو سال یہی ہوا کیا اُس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ رہے سسرال والے پہلے ہی سے طلاق مانگ رہے تھے اب

بڑے زور شور سے اس کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی زمانے میں بوا رحمانی کا
بھی انتقال ہو گیا۔ لڑکی کے ماں باپ مقدمہ چلانے پر تیار ہوئے
مگر جوہی خانم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری تقدیر میں جو کچھ ہونا تھا
ہوا اور جو ہونا ہے ہو گا ہو کے رہے گا۔ پہلے تو بے سوچے سمجھے جھونک
دیا اب فارغ خطی لکھواتے ہیں۔ میں طلاق ولاق نہ لوں گی اور خدا نے
چاہا تو عمر بھر لویں ہی پار کر دوں گی بہت سی کم سنی میں رانڈ ہوتی ہیں
آخر وہ یونہی پہاڑ ایسی جوانی کاٹ دیتی ہیں۔ دائم خاں میاں بی بی
کا سلوک جوں جوں اغیار در اندازیاں کرتے گئے اور اچھا ہی ہوتا
گیا۔ لوگ کہتے ہیں اور دیکھنے میں بھی یہی آیا ہے کہ بغیر زناشوئی رشتے
کے محبت قائم نہیں ہوتی۔ یہی فرق بہن بھائی اور میاں بیوی کی محبت میں بتایا
جاتا ہے مگر دائم خاں میاں بیوی کی یگانگی وہ استثنا سمجھئے جس سے ہر قاعدہ
مضبوط ہوتا ہے۔ اسی طرح دس پانچ برس گذرتے گئے اور بات پرانی دھرانی
ہوتی گئی۔ دوسروں پر اعتراض جانے کو نت نئے معاملات نکلا کرتے ہیں معاشرتی۔
مالی، جنسی گڑبڑیں ہوا ہی کرتی ہیں۔ اس قدیم فضیحتے کو لوگ کب تک سلئے
بیٹھے رہتے آخر بھول گئے۔ اگر کچھ لوگ نہیں بھولے تھے تو محلے کے دو چار
دل پھینک لونڈے تھے۔ اور خود دائم خاں کی سرکار کے دو ایک نوجوان نوکر جو
وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی عذر سے دائم خاں کے گھر پہنچ ہی جاتے تھے لیکن یہاں

عجیب رنگ تھا۔ لوگ نہ معلوم کیا کیا ارادے اور کون کون منصوبے گانٹھ کر آتے تھے مگر وہاں نگاہ میں کچھ ایسا برف۔ کافور۔ کتیرہ۔ کیلے کا پانی۔ برومائیڈ گھلا ہوا تھا کہ لونڈے کیا بڑے بڑے تماشبین سٹ پٹا جاتے۔ مسز سڈنس انگلستان کی بڑی مشہور ایکٹرس کی پرستش کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ شاہزادوں سے لے کر متوسط درجے تک پجاریوں کا ٹھٹھ سیکڑوں میں تھا۔ شریڈن بھی انھیں میں تھے۔ کسی نے کہا تعجب ہے کہ تم نے باوجود اس گرم جوشی کے مسز سڈنس سے کبھی اظہار عشق نہیں کیا۔ شریڈن نے کہا، ارے اُس کے رعبِ حسن میں وہ دبدبہ ہے کہ جو شخص اس سے اظہار عشق کرلے وہ آرچ بشپ آف کنٹربری سے بھی اظہار عشق کرلے گا۔ یہی حال جوہی خانم کا تھا۔ ایک آدھ بے تکے بے ہودہ آنے جانے والے نے مذاق میں یا کسی اور بھدے طریقے سے مُنھ پھوڑ کر اظہار مطلب بھی کیا مگر ایک ہی نگاہ میں کھسیانے ہو کر بھاگ آنا پڑا۔ زمانہ گذرتا گیا۔ لوگوں کی کوششیں جاری رہیں۔ میاں بیوی کی بے واسطہ محبت مضبوط ہوتی گئی۔ ہرج مرج میں یہ حال ہوتا تھا کہ اگر ایک کی اُنگلی دکھی تو دوسرا بے چین ہوگیا۔ عورت کو مرد کا جھوٹا موٹا سہارا بھی بہت ہوتا ہے لیکن مرد کو بھی ہمدردی کی کم ضرورت نہیں ہوتی۔ ظاہرا یہی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ یہ لوگ ایک جان دو قالب تھے۔ ورنہ معاملات ایسے تھے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کون تعجب

کی بات بھی۔ بعض عورتیں جو ہمدرد تھیں اور جن سے یہ بھی اپنے دل کا حال کہہ دیتی تھی ان سے اکثر باتیں ہوئیں۔ اُس نے صرف یہی کہا کہ مجھکو کوئی تکلیف نہیں ہے یہ بھی کہا کہ جب کوئی مرد اس طرح کا کوئی کنایہ کرتا ہے تو نہ صرف سر سے پاؤں تک آگ لگ جاتی ہے بلکہ یہ بھی جی چاہتا ہے کہ کنوئیں تالاب میں پھاند پڑوں۔ کہتی تھی کہ آبرو پر سے سو جانیں قربان ہیں۔ مختلف مردوں کے ڈورے ڈالنے کی مصیبت اس غریب پر اس وجہ سے اور زیادہ تھی کیونکہ میاں دائم خاں رشک کے مادہ سے بالکل بے واسطہ رہے۔ اگر کوئی مرد کسی بہانے سے گھر میں آیا تو اُنھوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور اگر نہ آیا تو کوئی پوچھ گچھ نہ کی گویا ان کے دماغ میں ڈاہ کا خانہ ہی خالی تھا۔ میاں دائم خاں کو کبھی زکام ہو گیا کبھی یوں ہی طبیعت شکست ہو گئی۔ مگر ان کی بیوی ہمیشہ عورتوں کی بیماری میں گرفتار رہتی تھی۔ کمر میں درد سر میں درد۔ آنکھوں میں تکلیف غرضکہ آئے دن روز کی بیمار تھی۔ ایسے وقتوں میں میاں دائم خاں کی بے چینی قابلِ دید ہوتی تھی۔ کہیں سر دبا رہے ہیں کہیں حکیم صاحب کے یہاں دوڑے جاتے ہیں کہیں قابلہ کی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ غرضکہ یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔

دائم خاں کی شادی کو تقریباً دس بارہ برس ہو چکے ہیں۔ جوہی خانم جوانی کے ہلے آب ریگستان کو پار ہی کیا چاہتی ہیں۔ مگر مثل ہے "عورت کو تین دِن

قبریں بھی بھاری ہیں"۔ عاشق تن لوگ اُس کی طرف سے کم و بیش مایوس ہو چکے ہیں۔ ٹوہ لگانے والی عورتیں طوطیا طوفان اُٹھانے والیاں بھی بے پرواسی ہو گئی ہیں کہ ایک نیا گل کھلا۔ پڑوس میں ایک آدمی کوئی پینتیس چھتیس برس کے سن کا آ کر رہا۔ ڈھونڈے نام نہ صورت نہ شکل نہ ایسی کمائی نہ اُٹھتی جوانی۔

رمضان شریف کے دن ہیں رات کے دس بجے ہیں میاں دائم خاں شبینہ پڑھنے بڑی مسجد گئے ہیں جعفر نامی ایک خدمتگار کچھ بچی کھچی افطاری بیگم صاحبہ کے حکم سے لے کر آیا۔ صدر دروازے کی طرف تو گیا نہیں۔ کھڑکی قریب تھی اُسی طرف آیا کھڑکی بند تھی مگر کچھ آہٹ پا کر اُس نے نہ آواز دی نہ زنجیر کھٹکھٹائی بلکہ دروازے میں کان لگا کر سُننے لگا کیا سُنتا ہے کہ دائم خاں کی بی بی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہیں "عورت کی دو ادرد۔ میں ہمیشہ کی بیمار۔ برسوں ہو گئے ٹھیک وقت یہ نہ سر دھو یا نہ بغیر تکلیف کے ایک مہینہ گذرا اور وہی اب ہوں کہ کوئی بیماری نہیں۔ دن بھر سر جھکا کر سیا کرو نہ آنکھوں کے ڈھیلے دکھیں نہ سر میں دھمک۔ پیدا ہوا کمر کا درد تو جیسے تھا ہی نہیں"۔ میاں جعفر بھی اُن کھیسانی بلیوں میں تھے جو کسی زمانے میں کھمبا نوچ چکے تھے اب کیا تھا پیٹ پکڑے دوڑے اور دوسروں کو خبر سنائی۔ آبرو بڑی قیمتی چیز ہے مگر دوسرے کی آبرو کوڑیوں کے مول

بیچنے میں سب کو لطف آتا ہے بس کیا تھا لوگ چڑھ دوڑے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خود نا کامیاب رہے تھے اور وہ بھی تھے جو مفت کی سیر دیکھنا چاہتے تھے اور چور چور کا ہلّڑ کر دیا دو چار آدمیوں نے چور کی ہانک لگائی۔ چالیس پچاس آدمیوں نے ڈنڈے لاٹھی لے کر گھر گھیر لیا۔ کچھ لوگ چاروں طرف اپنے کوٹھوں پر چڑھ گئے کہ چوٹے نکل کر نہ جانے پائیں۔ وہاں چور ہو تب تو نکلے، میاں ڈھونڈے شرمائے لجائے پریشان حال نکلے اور کہنے لگے میں تو آگ لینے آیا تھا۔ لوگوں نے ایک نہ سُنی بعض منچلوں نے دو چار گُدے بھی رسید کیے اور پکڑ کر رئیس صاحب کے پاس لے آئے دائم خاں کی بیوی بھی طلب ہوئیں۔ نہایت سراسیمہ سر سے پاؤں تک کانپتی ہوئی مُنھ چادر سے چھپائے آئی اور رئیس صاحب کے قدموں پر گر پڑی۔ رئیس صاحب کو ترس آیا اُس کو اندر بھیج دیا اور مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا۔ اتنے میں پولیس کا آدمی بھی آ گیا مگر صورتِ حال دیکھ کر دست اندازی کی کوئی وجہ نہ پائی۔ اگر وہ عورت غریب آشنائی میں پختہ کار ہوتی تو نہ معلوم کتنے بہانے ڈھونڈھ لیتی اور دوسروں کے پہلے شاید خود ہی چور چور پکار اٹھتی مگر وہ ایسی تو تھی نہیں۔ رئیس صاحب سے تنہائی میں اُس نے صاف

صاف کہہ دیا کہ آج اتنے دن مجھ کو اُن کے گھر میں آئے ہوئے جو حال ہے آپ سے چھپا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ آبرو پر سے جان قربان کرتی رہی البتہ اس معاملے میں مجھ کو جورو سیاہی بدی تھی وہ ہوئی اور میں تو کہوں گی اس میں بھی میرا قصور نہیں کیونکہ اٹھتی جوانی کا جو زمانہ تھا اُس میں نہ معلوم کتنوں نے میری آبرو لینی چاہی مگر میرا پاؤں نہ ڈگا۔ اب آدھی عمر گذر چکی تب لکھا پورا ہوا اُس کی صورت یہ ہوئی کہ جب جب میں نے اس مرد کو دیکھا تو میری حالت ہی بدل جانے لگی۔ اِدھر اس کا سامنا ہوا اور اُدھر میرا دل دھڑکنے لگا اور سر سے پاؤں تک تھرتھری سی پڑ گئی۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو گئی زبان سے نہیں نکلنا مشکل ہو گیا۔ دل میرا آبرو جانے پر رو دیا گیا مگر ہونٹھ بلا اختیاری میں مسکراتے رہ گئے میں اُس کو نہ تب چاہتی تھی نہ اب چاہتی ہوں۔ اب چاہے سر منڈوا کر اور مُنھ میں کالک لگا کر گدھے پر سوار کیجئے چاہے اجازت دیجئے کہ کچھ کھا کر سو رہوں اسی کے ساتھ یہ بھی خیال ہے کہ اگر میں مر گئی تو پھر اُن کی (دائم خان کی) کون خبر لے گا۔

جو ہی خانم کا ڈھونڈھے کی محبت سے انکار۔ ممکن ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ محبت سے انکار عورت اپنا فطرتی حربہ سمجھتی ہے ممکن

ہے اس وجہ سے رہا ہو کہ دائم خاں سے شادی کے بعد وہ سمجھنے لگی ہو کہ عورت کا جنسی حق اور مرد پر جان دے دینے کی صفت قیامِ ازل کے یہاں سے اُس کو ملی ہی نہیں ہے رہی دائم خاں سے محبت وہ کوئی بلند چیز رہی ہو۔ یا ہندوستانی رسوم کی گنگا میں پھسل پڑنے کے بعد صرف "ہر گنگا" رہی ہو اس میں کلام نہیں کہ اِن میاں بیوی کا تعلق وہ تعلق نہ تھا۔ جو عورت اور مرد کی محبت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رئیس صاحب پڑھے لکھے نیک دل آدمی تھے یہ بیان اس صفائی سے سُن کر دنگ رہ گئے اور بجائے نفرت کے عبرت سی ہوئی۔ میاں دائم خاں مسجد سے واپس ہوئے اُنھوں نے ہاں ناں کچھ نہ کہا۔ اور بیوی کو ساتھ لئے گھر چلے آئے وہاں پہنچ کر کہنے لگے۔ سب کے سب سالے ہماری آبرو لینے پر لگے ہیں مگر تم کچھ پروا نہ کرو لو مسجد سے یہ مٹھائی تمھارے لئے لائے ہیں کھالو تمھارا سحر گہی کا دودھ لا کر طاق پر رکھ دیا تھا تب مسجد گئے تھے دیکھنا "بلّی" تو نہیں پی گئی۔

لیجئے صاحب قصّہ ختم ہو گیا۔ میاں دائم خاں کے رقیب صاحب دوسرے دن غائب ہو گئے۔ دائم خاں کی بیوی کا کچھ

خطرہ سا ٹل گیا اور تب ہی سے کچھ بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگیں مگر اس حالت میں بھی میاں بیوی ایک دوسرے پر فدا ہی رہے بلکہ کچھ ایک دوسرے کا سہارا اور زیادہ ڈھونڈھنے لگے۔

(چودھری) محمد علی

تمام شد

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰	۱۵	راجولن	راجون	۸۶	۲	کاپلٹ	کایا پلٹ
۱۶	۹	پرداہ	پردا	۸۶	۱۲	تو لی را	تُولی را
۱۷	۱۲	بڑی	بڑی	۸۷	۱۰	بوسہ ٹپکتا ہے	×
۲۶	۴	کرتے نہیں سُنا	کرتے سنا	۸۸	۱۳	یہاں جو کیسے	یہاں کیسے
۲۷	۱۷	جاتی ہیں	آجاتی ہیں	۹۵	۱۱	دو ہی میں تھے	دو ہی تین تھے
۳۳	۲	اس	اُسی	۹۶	۱	کا	کو
۳۳	۴	طلاوا	بلادا	۱۰۲	۱۵	کورکب	کلارک
۳۴	۵	ارادہ تھا	ارادہ تھا کہ	۱۰۳	۱۰	بڑھو	بڈھے
۳۷	۷	نہ کوئی پیچھے	نہ کوئی پیچھے مجبوراً کری کلی	۱۰۷	۳	پڑا	چ
۳۹	۱۵	لرک	لوگ	۱۰۷	۱۴	دو	پیارے
۴۵	۴	خریں	خریدیں	۱۰۸	۳	ہرفت	برفت
۴۶	۱۳	روزہ رکھنے کے	روزہ رکھنے کی عذاب میں	۱۰۸	۴	بادخاہ ست	بادشاہ نست
۵۲	۷	پھنسی تو ہنسی	ہنسی تو پھنسی	۱۰۹	۵	ایک راجہ	راجہ
۶۰	۱۵	جال	جان	۱۰۹	۹	لیوفا دی	لیوی ہوئی
۶۱	۱۴	خدااورزاق	خدا رزاق	۱۱۳	۱۰	ننھی سا پھوڑا جاند	ننھی سا پھوڑا
۶۳	۱۰	نے کرکہا	نے کہا	۱۱۶	۸	سم	عم
۶۸	۷	کون کون کو فند	کون کون خند	۱۱۷	۲	ابی فورس	ابی قورس
۶۹	۹	اختیار تھا	اختیار کیا تھا	۱۳۲	۲	تمرر	کرر
۷۰	۱۱	ٹائمس	ٹائیمنس	۱۳۶	۹	ملتی تھی	ملی تھی
۷۳	۱۴	فرماں	فرما	۱۳۷	۱۱	تکیے اٹھائے	تکیے کھائے
۷۴	۲	والے	والوں کے	۱۵۲	۱۰	گمہ	گلا
۷۷	۶	سمجھنے	پہنچتے	۱۵۲	۱۵	راڑ دالی	راڑ ڈالی
۷۷	۹	لیکن دوپٹہ	کہیں ڈوپٹا	۱۵۳	۱۲	لکھا	کہا
۷۹	۱۱	وہ بندر	وہ	۱۵۷	۱۲	تھی	یہی
۸۳	۱۵	گھر	گھر	۱۵۷	۱۶	دیا جارہا	دیا جارہا تھا، مرزا سجاد کیمنے تھے لکھنؤ میں ایک بکہ روقعہ سے
۸۴	۳	جھگو آنے دو	آنے دو				
۸۴	۱۰	ھری	گٹھری				
۸۵	۷	غمزہ خاص ہر گر سلسال داری	×				

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶۹	۱۵	جنسی	جنسی
۱۶۰	۲	امرولی	اہرولی
۱۶۰	۳	ابرولی	اہرولی
۱۷۰	۶	جواس	حواس
۱۷۲	۲	کنگڑ	کنگڑے
۱۷۷	۶	اوپر	اودہر
۱۷۷	۱۴	جزو افزا	جزع فزع
۱۷۸	۴	دل سے مجبور	دل سے کیونکر مجبور
۱۸۱	۳	ہرانے	دوہرانے
۱۸۳	۱۷	مشورے	مسودے
۱۸۹	۱۰	انگریز	کمرانی
۱۹۴	۳	ایک پاؤں	ایک جگہ پاؤں
۱۹۴	۹	کردی بات	کردی اگر یہی بات
۱۹۵	۲	کیڈمی	اکیڈمی
۱۹۷	۱۰	بندہ	معتقد بندہ
۱۹۹	۱۲	پچی	بچی
۲۰۴	۱۵	ہمن	پچن
۲۰۷	۱۷	کرہی	کوڑھی
۲۱۰	۷	انسان	مگر انسان
۲۱۰	۱۴	جنتی	جتنی
۲۲۲	۱۶	دیکھنا	رکھنا
۲۲۸	۹	قیب	رقیب
۲۳۴	۸	اچھلاہٹ	اچپلاہٹ
۲۳۴	۹	جھڑکی	چٹکی
۲۳۴	۱۱	جائیں	جائن
۲۳۴	۱۱	حرکت حدت	حدت حرکت
۲۳۸	۳	پہلی بیوی بھی	بیوی بھی
۲۳۵	۳ و ۴	جیسے دکھوں...ویا تھا	×
۲۳۵	۱۰	گزر گیا	گزرتا گیا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳۶	۹	پر پھیر	ہر پھیر
۲۳۸	۲	یہ ہو رہا ہے	یہ جو ہو رہا ہے
۲۴۰	۲	بعد کو کہے گا	بعد کو یہ نہ کہے گا
۲۴۰	۱۱	ہندوستاں میں	ہندوستانی
۲۴۳	۹	کلے	کے
۲۴۳	۱۷	بڈھاپا	بڑھاپا
۲۴۵	۲	بڑہی	بڑی
۲۴۷	۱۶	بلپیر بھی	پر بھی
۲۵۳	۶	نہ ہی ہو	نہ رہی ہو
۲۵۴	۱۲	کام میں	کاموں میں
۲۵۸	۱	لے آئی	سے لے آئی
۲۵۹	۳	کرکے شاعر	کرکے کرفاعر
۲۵۹	۱۷	مختصر وہی	مختصر یہ وہی
۲۶۰	۴	شو	شعر
۲۶۲	۵	بیاہی	بیاہ
۲۶۳	۱۶	پھاندے کے یوں	پھاندے یوں
۲۶۶	۱۴	گائے گئو	"منہ" سے گئو
۲۶۶	۱۴	گائے گدھیو	"گا" سے گدھیو
۲۶۸	۴	انداز	انداز قد فقیری
۲۶۸	۴	بیچا ناچا ناہی	
۲۶۸	۵	برگ سبز تحفہ	برگ سبز است تحفہ
۲۷۸	۶	سرائیں	سراہے جائیں
۲۸۰	۱۵	بنگ	جنگ
۲۸۵	۱۲	چھپ	چھب
۲۹۰	۱۳	تکلیف	تکلف
۲۹۷	۱۱	لقائی توبہ	لقائے تو
۳۱۱	۱۴	خرب	خواب
۳۱۳	۹	آئی تھی گر وہاں	آئی تھی وہاں
۳۱۷	۷	جوانی کاٹ دیتی	جوانی نہیں کاٹ دیتی

ایک مختصر فہرست کتب

پبلشر:۔ صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

انجمن ترقی اردو ہند کی نایاب کتابیں

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
آرائش محفل شیر علی افسوس	سے ۸/	جاپانی بچوں کے گیت	۸/	فرہنگ اصطلاحات علمیہ (تین جلد)	للعہ ۸/
ارتقا	عہ/	چمنستان شعراء	للعہ ۱۲/	فن شاعری (بوطیقا)	عہ ۴/
اردو شیری کولیشن کورس	عہ ۱۲/	حبش اور اطالیہ	عہ/	قواعد اردو (عبدالحق)	عہ ۸/
اضافیت	۱۲/	حقیقت جاپان	سے/	کلیات ولی	للعہ ۸/
اقبال	للعہ/	حکایات رومی کامل	عہ/	گوتم بدھ	عہ ۸/
انتخاب داغ	عہ ۱۲/	حیات اجمل	عہ/	انڈرو	عہ/
انتخاب کلام میر	عہ ۸/	حیات سر سید	سے ۸/	مذہب اور دھرم	للعہ/
انتخاب وحید	عہ/	خواب و خیال (مثنوی)	عہ/	مشرقی کتب خانہ	سے/
باغ و بہار مجلد	سے ۸/	داستان دانش	سے/	مشاہیر یونان و روما کامل	لعہ/
بجلی کے کرشمے	عہ/	دریائے لطافت	عہ ۸/	مشترکہ زبان	للعہ ۸/
پرچھائیں	للعہ/	دلی کی عجیب ہستیاں	عہ ۸/	معدنی [illegible]	عہ/
پودے اور ان کی زندگی	عہ ۴/	دیوان اثر	عہ ۸/	مکالمات سائنس	عہ/
پیاری زمین	سے ۴/	دیوان تاباں	عہ/	ملک محمد جائسی	عہ ۸/
پیام شباب	عہ ۱۲/	دیوان نظیر اکبرآبادی	عہ ۸/	نصرتی	سے ۸/
تاریخ ادبیات ایران جلد	للعہ ۸/	دیوان یقین	عہ/	نفسیات افواہ	عہ ۱۲/
تاریخ انگلا	سے ۸/	ذکر میر	عہ/	نکات الشعراء	عہ ۱۲/
تاریخ مگدھ (بہار)	للعہ ۱۲/	رند پارسا (ریاض خیرآبادی)	للعہ ۸/	ہماری ریلیں اور سڑکیں	عہ ۲/
تاریخ سلاطین بہمنیہ	عہ/	سراج الدولہ	سے/	ہماری قومی زبان	۸/
تاریخ ہند	عہ ۱۰/	سفرنامہ ناصر خسرو	سے/	ہمارے مزدور	۸/
تاریخ یونان مجلد	عہ/	سودا (شیخ چاند)	للعہ ۸/	ہماری غذا	عہ ۱۰/
تمہیدی خطبے مجلد	عہ ۸/	علم الاقوام (کامل)	سے ۴/	یادگار حالی	للعہ ۴/
جاپان اور اس کا تعلیمی نظام	سے ۱۲/	علم المعیشت			

حضرت شوکت تھانوی کے افسانوں کے مجموعے

بحرِ تبسم

دلکش مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ فکرمند اور تھکے ہوئے دماغوں کیلئے تفریح کا سامان، مضامین کیا ہیں کشتِ زعفران ہے۔ کہ آپ کو خود بخود ہنسی آنے لگے۔ قیمت ے ر

دنیائے تبسم

ہنستے ہنسانے والے پُر لطف مزاحیہ مضامین، پڑھتے جائیے ہنستے جائیے، انداز بیان میں شگفتگی اور انوکھا پن لفظ لفظ میں لطافت، دلبستگی اور تفریح کا خزانہ۔ قیمت عہ

طوفانِ تبسم

عجیب مضحکہ آفریں واقعات افسانوی اور ظریفانہ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں، پڑھنے والا یقیناً ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مزاحیہ طرزِ تحریر کا ایک بہترین نمونہ ہے
قیمت عہ

موجِ تبسم

ان افسانوں میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ہر افسانہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اسمیں دس بارہ ایسے مخصوص مضامین ہیں جنمیں کا ہر مضمون ایسا دلچسپ ہے کہ سو بار پڑھنے پر بھی سیری نہیں ہوتی ٹائٹل عمدہ مصور کتاب مجلد قیمت ے ر

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ

نیاز فتحپوری کی متفرق کتابیں

ترغیبات جنسی - بدکاری یا فحاشی کے اسباب پر بحث، اُس کی ابتدا، دنیا میں کس طرح ہوئی مذہبی حیثیت سے فحاشی کو خاص درجہ دیا جانا اور اس کے اسباب و حقائق - مجلد - .... قیمت صر

فراست الید - اس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر دوسروں کے ماضی، حال اور مستقبل کے حالات پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے - .... قیمت عہ

فلاسفۂ قدیم - اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے حکمائے قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) ادیبین کا مذہب (۳) حرکت کے کرشمے - نہایت مفید کتاب ہے - قیمت ۸؍

گہوارۂ تمدن دنیا کی تہذیب اور تمدن بہت کچھ عورت کا رہین منت ہے - عورت ہی وہ مقدس ہستی ہے جس نے تہذیب و تمدن کو اس درجہ پر پہنچایا، زمانۂ قدیم سے عورت ارتقائے عالم کے مسئلہ میں پیش پیش رہی ہے لباس اور برتنوں کی ایجاد، فنون لطیفہ، زبان، مذہبی خیالات اور جماعتی نظام کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے - .... قیمت عاؔر

مذہب - مصنف کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ ہے جسمیں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا - ...... قیمت عہ

من و یزداں - مولانا نیاز فتحپوری کی چالیس سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جسمیں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے کامل للعہ

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو - لکھنؤ

نیاز فتحپوری کے ناول اور افسانے

جمالستان :- نیاز کے افسانوں کا دوسرا قابل قدر مجموعہ - قیمت مجلد عہ

حُسن کی عیاریاں :- بڑی ہی رنگین اور پرلطف داستانیں - قیمت عگر

شاعر کا انجام :- یہ افسانہ ۱۹۱۳ء میں لکھا گیا تھا حُسن و عشق کی نشہ بخش کیفیات لفظ لفظ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشار کے لحاظ سے بے نظیر ہے .... قیمت ۱۲ر

شہاب کی سرگزشت دنیائے ادب کا پہلا افسانہ جس کی نفسیاتی سیرت نگاری، رنگینی خیال اور نزاکت بیان کے لحاظ سے طمانہ حیثیت رکھتی ہے جو ازدواجی زندگی کی حقیقت پر کیفیات لذت الم پر عجیب و غریب کارنامہ ہے قیمت عگر

کیوپڈ اینڈ سائیکس :- کیوپڈ اینڈ سائیکس کے عشق کی داستان محبت - قیمت ۸ر

مختارات نیاز :- نیاز کے مضامین اور افسانوں کا ایک نادر مجموعہ - قیمت ہے

نگارستان :- نیاز صاحب کے افسانوں کا پہلا مجموعہ .... قیمت للعہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد مسلم سوسائٹی کے تباہ کرنے والے چند خود لیڈر اور شاہ صاحبان کی بداعمالیوں کا خاکہ دلچسپ انداز میں .... قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو - لکھنؤ

رسالہ نگار کے خاص نمبر

نگار جنوری ۱۹۴۳ء — اس میں ملک کے مشاہیر اہل قلم نے ریاض کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے قیمت عمر

نگار فروری ۱۹۴۶ء — جس میں فن انتقاد پر ملک کے مشاہیر ارباب فکر کے مضامین ہیں۔ قیمت عمر

نگار جنوری ۱۹۴۷ء — اس نمبر میں ایک بےمثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ .... قیمت ؎

نگار جنوری فروری ۱۹۴۸ء — (پاکستان نمبر) اس نمبر میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ .... قیمت ؎

نگار جنوری ۱۹۴۹ء — اس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شامل ہیں۔ قیمت عمر

نگار جنوری فروری ۱۹۵۰ء — نگار کی ۳۰ سالہ ادبی اور تنقیدی خدمات کا نچوڑ۔ تمام تنقیدی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے .... قیمت ؎

نگار جنوری ۱۹۵۱ء — اس میں مارسن ہڈسن کی مشہور عالم کتاب مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے۔ جس میں اسلامی ممالک کی سیاحت کے بعد فاضل مصنف نے ان ممالک کے زوال کی تصویر کھینچی ہے اور ان کے زوال کے اسباب بتائے ہیں کہ جن کے مطالعہ سے ترقی کی شاہراہ کا نشان ملتا ہے۔
قیمت .... عمر

نگار جولائی ۱۹۵۱ء — یہ نمبر نفسیات عملی پر ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ زندہ رہنا بھی ایک فن ہے۔ اگر اس حقیقت کو آپ نے سمجھ لیا تو زندگی کامیاب ہو جائے گی اور راحت ہی راحت نظر آئے گی اور آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا۔
قیمت .... ۱۲؍

نگار سالنامہ ۱۹۲۸ء — مومن کی شاعری اور ان کی سوانح حیات کا تفصیلی بیان۔ قیمت .... عمر

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو لکھنؤ

شوکت تھانوی کی متفرق مزاحیہ کتابیں

برق تبسم :- شوکت صاحب کے مزاحیہ مضامین کا ایک نادر مجموعہ ۔ قیمت ۳/

مسکراہٹیں :- مزاحیہ عجیب مضامین کا خوبصورت مجموعہ ، مجلد قیمت عہ/

سُنی سُنائی :- شوکت صاحب کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ قیمت عہ/

شیش محل :- شوکت صاحب نے اپنے احباب شعراء اور ادباء کا خاکہ اپنے مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے قیمت ۔/

شوکتیات :- چند مزاحیہ مضامین اور خاکے قیمت عہ/ ۱۲/

لاہوریات :- لاہور کے متعلق مزاحیہ مضامین کا مجموعہ قیمت عہ/

گہرستان شوکت تھانوی کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس پر ملک کے ادبار اور شعراء نے بہترین ریویو کئے ہیں، کلام میں پختگی بھی ہے اور روانی اور صفائی بھی، قابل قدر مجموعہ ہے قیمت .... عہ/

نورتن :- متفرق مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ۔ قیمت عہ/

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو لکھنؤ

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ